اُردو نثر کی داستان

قسط ۹

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

میر بہادر علی حسینی اور
فورٹ ولیم کالج کی ایک
یادگار کتاب 'اخلاقِ ہندی'
کا انتخاب

مؤلف:
اے حمید

۹
روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی' اَدبی مارکیٹ' چوک انار کلی، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیرِ مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - عینکاف خالد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور
فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۴۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

ہتوپدیش کا اُردو ترجمہ

'اُردو نثر کی داستان' قسط ۹ پیشِ خدمت ہے۔ اس حصۂ نثر میں میر بہادر علی حسینی کے حالاتِ زندگی اور فورٹ ولیم کی ایک یادگار کتاب 'اخلاقِ ہندی' کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج سے متسلک تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اُن کے متعلق بہت کم لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی بہت کم منظرِ عام پر آئے ہیں۔ تاہم اب بھی بعض کُتب ایسی ہیں جن سے اُن کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکتی ہیں میر بہادر علی حسینی دہلی کے باشندے تھے اور دو سو روپے ماہوار مشاہرہ پر فورٹ ولیم کالج کے ملازم تھے۔ گل کرائسٹ نے ان سے درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی لیا۔ میر بہادر علی حسینی اُردو زبان کے بڑے قابلِ توقیر اہلِ قلم تھے۔ اُنھوں نے سحر البیان کے طور پر ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں بدرِ مُنیر اور بے نظیر کا مشہور قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام "نثرِ بے نظیر" ہے۔

اس وقت زیرِ نظر قسط میں جو 'اخلاقِ ہندی' کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ میر بہادر علی حسینی ہی کا ترجمہ ہے۔ سنسکرت کی اس قدیم ترین کتاب 'ہتوپدیش' کا ترجمہ پہلے پہل مفتی تاج الدین نے 'مفرح القلوب' کے نام سے فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس کے بعد حسینی نے اس کتاب کو فارسی سے اُردو میں منتقل کیا اور اس کا نام 'اخلاقِ ہندی' رکھا۔۔۔۔ 'ہتوپدیش' کے اس اُردو ترجمے میں تمام کہانیاں ایسی ہیں جن میں جانور اور پرندے کردار بن کر سامنے آتے ہیں اور مشکل اوقات میں عقل مندی کی باتیں کر کے صحیح راہ دکھاتے ہیں۔ 'اخلاقِ ہندی' کے بارے میں جناب ڈاکٹر وحید قریشی رقمطراز ہیں :

" اخلاقِ ہندی، اخلاقیات کی کتاب ہے۔ اس میں واقعات کی اپنی جداگانہ حیثیت کوئی نہیں ہے۔ ہر واقعہ ایک کھونٹی ہے جس پر جا بجا اخلاقی اقوال کو لٹکا دیا گیا ہے۔ ہر کہانی آخر میں آ کر کسی نہ کسی اخلاقی نکتے کی ترجمانی کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ 'اخلاقِ ہندی' کی زبان ایک درسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ یہ زبان باغ و بہار کی زبان کی طرح جاندار و چونبد اور تخلیقی ادب پارے کا درجہ نہیں رکھتی لیکن اس میں تدریس کا پہلو باغ و بہار کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔"

قارئین! 'اُردو نثر کی داستان' کے ساتھ آج کی دوسری کتاب 'مجاہدِ اوّل' ہے۔ یہ کتاب خدا کی راہ میں پہلا تیر چلانے والے عظیم صحابیٔ رسول حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل ہے۔ عبدالکریم خالد اس کتاب کے مؤلف ہیں۔ انھوں نے نہایت خوبصورتی سے حضرت سعدؓ کی پوری شخصیت کو حیطۂ تحریر میں لیا ہے۔

دنش جلاکو مُسلم شخصیات کے انسائیکلو پیڈیا کے ساتھ منفرد ناول نگار جناب اے حمید کا ایک خوبصورت ناول 'جنگل روتے ہیں' پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے یہ ناول آپ ضرور پسند فرمائیں گے۔

نیاز احمد

ھتوپدیش کا ترجمہ — اخلاق ہندی

اخلاق ہندی کی تاریخ

سنسکرت کی اس قدیم کتاب کا ترجمہ مفتی تاج الدین نے فارسی زبان میں "مفرح القلوب" کے نام سے کیا فارسی زبان کی کتاب سے میر بہادر علی حسینی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا جسے "اخلاقِ ہندی" کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند نے سنسکرت کی کتاب ھتوپدیش کے ہر عہد کی اشاعت کا حال یوں بیان کیا ہے۔

سنسکرت : ھتوپدیش (نرائن بھٹ)
ہندی : ترجمہ از نابھاداس یا نرائن داس (۱۵۵۸ء)
ترجمہ از پنڈت بدری لعل ۱۸۵۱ء، مرزاپور

ترجمہ مع اصل ، داسیشور بھٹ ۱۸۹۵ء بمبئی
فارسی : مفرح القلوب ، مفتی تاج الدین، سنسکرت سے یا چندسین کے ہندی ترجمے سے
انگریزی : ۱۸۸۶ WILKINS
سر ولیم جونز ۱۶۹۹ء
جانسن ۱۸۴۵ء
ایڈون آرنلڈ ۱۸۶۱ء
فرنچ : LANGLES ۱۸۹۰ء پیرس
لین سراں ۱۸۵۵ء
جرمن : میکس مُلر ۱۸۴۴ء لیپزگ
DURSET ۱۸۵۳ء
GADE ۱۸۵۹ء
L.FRITRE ۱۸۶۴ء برسلا
یونانی : ڈیمٹریس
GALAMOS
G.K.THYPALDOS
۱۸۵۱ء مع تنک پیتنی اور پنتال پچیسی
(اردو نثری داستانیں صفحہ ۵۷۵)
اردو : اخلاقِ ہندی ، بہادر علی حسینی ۱۸۰۲ء
جواہر بے بہا ، پنڈت شمبو ناتھ ۱۹۰۲ء
(سنسکرت سے)
منظوم (مفرح القلوب سے) پنا میرپرشاد ۱۹۰۲ء دلّی

میر بہادر علی حسینی کے حالات زندگی

میر بہادر علی حسینی کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم تھا اور وہ دہلی میں رہتے تھے۔ ان کے زیر اہتمام ہی حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا اردو ترجمہ قرآن مجید پہلی بار دہلی میں طبع ہوا۔ سید عبداللہ کاظم کے بارے میں سیّد محمد مولف، ارباب نثر اردو لکھتے ہیں۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مولفین کی طرح میر بہادر علی حسینی کے ساتھ بھی بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔ اس لیے ان کے حالات زندگی کا پتا چلانا سخت مشکل ہے۔ اتفاق سے ہم کو ان کی تالیفات اور منشی کریم الدین کے تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" اور چند متفرق ذرائع سے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ میر بہادر علی حسینی کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم ہے اور یہ وہی صاحب ہیں جن کی سعی و اہتمام سے حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا اردو ترجمہ قرآن مجید پہلی بار شائع ہوا ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ حسینی خاص دہلی کے باشندے ہیں یا کسی اور شہر کے۔ مگر بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن شاہجہان آباد دہلی تھا۔ حضرت عبدالقادر صاحب دہلی میں تشریف رکھتے تھے اور آپ کے ارشد ہدایت سے خاص طور پر اہل دہلی مستفید ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ ترجمۃ القرآن کا پہلا ایڈیشن بھی جو حسینی کے والد کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ دہلی ہی میں طبع ہوا۔ اس بنا پہ خیال ہوتا ہے کہ حسینی دہلی کے باشندے تھے اس کے علاوہ ایک اور شہادت یہ ہے کہ میر امن اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچے میں فورٹ ولیم کالج میں اپنے ملازم ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر کے رسائی ہوئی۔ میر امن کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسینی سے ان کی گہری اور بے تکلف دوستی تھی۔ میر امن خاص دہلی کے باشندے تھے۔ جب وہ تلاش معاش میں دہلی سے نکلے تو پہلے چند سال عظیم آباد میں گزارے اور پھر کلکتے کا رخ کیا۔ ان کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ حسینی سے یا تو دہلی ہی سے راہ و رسم رکھتے تھے یا ان کی ملاقات اور شناسائی عظیم آباد میں ہوئی۔ مگر ہمارے نزدیک پہلا خیال مرجح ہے اور حسینی ضرور میر امن کے اہل وطن اور دہلی ہی کے بے تکلف دوست ہوں گے۔

ڈاکٹر وحید قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ —— فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ میر بہادر علی حسینی چیف منشی ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو بمشاہرہ دو سو روپے ماہوار ملازم ہوئے اور میر امن بھی اسی تاریخ کو (میر بہادر علی حسینی کے ایما پر) ملازم رکھے گئے۔ گل کرسٹ نے درس و تدریس کے علاوہ ان منشیوں سے تصنیف و تالیف کا کام لینا شروع کیا اور کتابیں شائع کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ اس سلسلے میں ۱۲ر جنوری ۱۶ر جنوری اور پھر ۲۰ر جنوری ۱۸۰۲ء کو اس نے کالج کونسل سے خط و کتابت کی اور آخری تاریخ کو شرطیں پیش کیں۔ ان میں بہادر علی حسینی کے بارے میں لکھا ہے۔ تالیف و ترجمہ اور نقل کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ لیکن حکومت میر بہادر علی حسینی کو اپنے مصارف پر میر ماتحتی میں ہندوستانی کتابوں کے مقابلے اور ان کی تصحیح کے کام پر بحال رکھے۔ ۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ کے جانے کے بعد یا تو بہادر علی ملازمت سے الگ ہو گئے یا ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کے بعد لارڈ منٹو کی گورنر جنرل کے زمانے میں واغ عظیم آباد کلکتہ گئے تو انہوں نے دوسرے منشیوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن میر بہادر علی کا تذکرہ نہیں کیا۔ واغ ۱۲۲۰ ہجری میں کلکتے میں تھے۔ شعرا کے ضمن میں انہوں نے افسوس کاظم علی، مظہر علی ولا کا ذکر کیا ہے اور ٹیلر کو جو اس زمانے میں مدرس ہندی تھے، خراج عقیدت پیش کیا ہے اور دوسرے منشیوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن حسینی کا ذکر مفقود ہے۔ جس سے یہ قیاس بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے تک حسینی کا کوئی تعلق کالج سے باقی نہیں رہا۔ کتابوں کی تالیف اور نظر ثانی کے ضمن میں منشیوں میں کچھ اختلاف گل کرسٹ کی موجودگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ افسوس نے اس کا ذکر دبے لفظوں میں آرائش محفل میں کیا ہے۔ اس میں حسینی غالباً فریق مخالف تھے۔ ممکن ہے حسینی کا ترک تعلق کسی ایسی ہی مناقشے کے سبب ہوا ہو۔ کسی معاصر تذکرہ نگار نے حسینی کا تفصیلی حال نہیں لکھا۔ قریبی زمانے کے صرف دو ماخذ ہمارے سامنے ہیں جو اہم ہیں۔ ایک گارسین دتاسی کی، تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی اور دوسرے اس کی اضافہ شدہ تلخیص طبقات الشعرائے ہند، از کریم الدین، بعد کے تذکرہ نگاروں یعنی تمنا (سیر المصنفین) رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو) موہن سنگھ دیوانہ (تاریخ ادب اردو) حامد حسن قادری

(داستانِ تاریخ اردو) نسیم قریشی (اردو ادب کی مختصر تاریخ) اعجاز حسین (مختصر تاریخ ادبِ اردو) نظامی بدایونی (قاموس المشاہیر) بیل (بائیو گرافیکل ڈکشنری) عقیل احمد (یادگارِ شعرا) وغیرہ نے ارباب نثرِ اردو، اور کریم الدین کے بیانات کو دہرایا ہے۔

گارسین دتاسی تحریر کرتے ہیں۔

"میر بہادر علی حسینی ہندوستانی زبان کے بڑے قابلِ توقیر اہلِ قلم ہیں۔ آپ مشہور و معروف (شاعر) حسن کی مثنوی بے نظیر اور بدرِ منیر کی نقل کے مصنف ہیں یہ ۱۲۱۷ ہجری (۱۸۰۲ء) میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی زیرِ نگرانی میر شیر علی افسوس کی نظرِ ثانی کے بعد کلکتے میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "نثرِ بے نظیر" ہے اس میں شعروں کی بھی طاوٹ ہے۔ بے نظیر، سحر البیان کے ہیرو کا نام ہے۔ ۱۸۰۲ء میں اس کا ایک ایڈیشن تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا جسے "بیاضِ ہندی" کا ایک حصہ بننا تھا، مگر اس کے صرف ۴۸ صفحے شائع ہوسکے۔ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ۱۸۰۳ء میں آئی۔ آپ ہندوستانی گرامر پر ایک رسالے کے بھی مصنف ہیں جس کا نام قواعدِ ہندی یا قواعدِ اردو یعنی ہندوستانی زبان کے اصول ہیں۔ یہ گل کرسٹ کی گرامر کی تلخیص ہے۔ کیونکہ یہ کلکتہ میں گل کرسٹ کے نام سے چھپا۔ آپ ہتوپدیش کے ہندوستانی ترجمے کے بھی مصنف ہیں جسے آپ نے اخلاقِ ہندی یعنی ہندی اتھیکس کے نام سے ۱۸۰۲ء میں لکھا۔ بہار کے نواب نصیر الدین کے حکم سے اس کا فارسی ترجمہ ہوا، جس کا نام "مفرح القلوب" ہے حسینی کے نسخے کا بھی یہی عنوان ہے۔ ہمیں یہ کتاب ایسٹ انڈیا ہاؤس کے قیمتی کتب خانوں، برٹش میوزیم اور دوسری جگہوں پر بھی ملتی ہے۔ ہندوستانی ترجمہ کلکتہ میں ۱۸۰۳ء میں اور مدراس میں دوبارہ چھپا۔ اس کے کچھ اجزا ۱۸۲۸ء میں ایس آرنو کی وساطت سے لندن میں چھاپے گئے۔ اس ترجمے کا خلاصہ تارنی چند مترا اور کلکتہ کے ڈبلیو پرائس کے ہندی اور ہندوستانی انتخابات میں بھی ملتا ہے۔ اس تصنیف کے اور بھی ہندوستانی ترجمے ہیں۔ کنگز کالج لندن کے پروفیسر ایم ڈی فوربس کے پاس ترجمے کا ایک نسخہ ہے، جو بہادر علی والے نسخے سے بالکل مختلف ہے یہ ترجمہ بہت لفظی ہے اور معلوم ہوتا ہے بنگالی میں ہوا۔ بدقسمتی سے اس کے مصنف کا نام نہیں ملتا۔

کلکتے میں ۱۸۰۳ء میں یہ اعلان ہوا کہ ہتوپدیش کا ٹھیٹھ ہندی میں ایک ترجمہ زیرِ طبع ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ وہی ہے جس کی ایک کاپی کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کے پاس ہے۔ اس کا ذکر بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں (بزبانِ انگریزی) کیا گیا ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں بھی ہتوپدیش کا ایک مخطوطہ ہے جس میں ہندوستانی ترجمے کے ساتھ سنسکرت اصل بھی ہے۔ یہ شلوک در شلوک ترجمہ کیا گیا ہے۔ ایک چھوٹی سی ۱۵ × ۲۵ ۔ ۱۴۰ پر دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ کتابت بہت اچھی ہے۔ حسینی آسام کی تاریخ کے ترجمے کے بھی مصنف ہیں۔ اس کا نام "ترجمہ تاریخ آسام" ہے۔ جو کہ ۱۸۰۶ء میں ہندوستانی علوم کے ماہر کول بروک کے ایما پر کیا گیا۔ یہ دلچسپ تاریخ ولی احمد شہاب الدین طالش نے اورنگ زیب کے عہد میں لکھی۔ حسینی کے کام میں سب سے اہم ترجمہ یہی ہے۔ میرے پاس اس کا ایک مسودہ ہے جس کے لیے میں بنگال کی ایشیاٹک کے سیکرٹری ایم جے پرنسپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ جو کہ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری سے آیا ہے۔ حسینی اردو نیل فیبولٹ کے بھی مصنف ہیں جو کہ لقمان اور دوسرے مصنفین کی کہانیوں کا ہندوستانی ترجمہ ہے اور جسے ڈاکٹر گل کرسٹ نے شائع کیا ہے۔ آپ قرآن مجید کے ہندوستانی ترجمے میں بھی شریک تھے۔"

تذکرہ کریم الدین میں یوں درج ہے۔

"میر بہادر علی حسینی بہت ذی قدر شاعر ہے۔ اس نے "سحر البیان" کے طور پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں بدرِ منیر اور بے نظیر کا قصہ مشہور بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام "نثرِ بے نظیر" ہے مگر نظم اس میں ملا ہوا ہے۔ درمیان ۱۸۰۲ء کے کلکتہ میں چھپی تھی اور ایک رسالہ بنام "قواعدِ اردو" جو کہ بنام رسالہ گل کرسٹ اردو زبان کے صرف و نحو چھپایا گیا ہے۔ تیسرا ترجمہ ہندوستانی ہتوپدیش کا بنام "اخلاقِ ہندی" جو اس نے درمیان ۱۸۰۲ء کے ایک فارسی ترجمے سے جو بہ حکم شاہ ناصر الدین حیدر نواب بہار کے بنام "مفرح القلوب" کے تیار ہوا تھا، اس نے کیا تھا۔ اس کتاب کے ترجمے اردو میں بھی ہوئے ہیں۔ اور ایک ترجمہ ہتوپدیش کا ہندی میں چھاپا گیا درمیان ۱۸۰۳ء کے۔ وہ ترجمہ بھرت پور کے راجہ کے ایک پنڈت نے تیار کیا تھا۔ چوتھا کہ اس نے ایک تاریخ آسام کا بھی درمیان ۱۸۰۵ء کے بہ موجب خواہش کولبرک صاحب کے تیار کیا تھا۔ اس دلچسپ تاریخ کی اصل اورنگ زیب عالمگیر کے وقت میں ولی احمد شہاب الدین طالش نے لکھی تھی۔ یہ ترجمہ اور تصنیفات اس کی سے عظیم القدر ہے اور ان کتابوں مفصلۃ الذیل میں اس نے مدد دی تھی۔ ترجمہ قصہ لقمان وغیرہ کے مصنف ہیں جو ڈاکٹر گل کرسٹ صاحب نے چھپوائی تھی۔ اور ایک ترجمہ قرآن مجید کا اردو میں جس میں سوائے مددگاروں کے کاظم علی جوان کی بھی مدد تھی۔ جس میں باپ سید عبد اللہ کاظم کا جس نے مولوی عبد القادر کے اردو ترجمۂ قرآن حکیم کا چھپوانے میں اہتمام کیا تھا۔ — تذکرہ کریم الدین — صفحہ ۲۵۸۔

اخلاقِ ہندی کی کہانیاں

ہتوپدیش کے اس اردو ترجمے میں بھی کہانیاں ایسی ہیں جن میں جانور اور پرندے کردار بن کر سامنے آتے ہیں اور کٹھن وقت میں دانشمندی کی باتیں کرکے راہ دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان کہانیوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ "یہ کہانیاں ان بادشاہوں کے مطلب کی ہیں جن کی محض ایک شہر پر حکومت ہوتی تھی اور جس حکومت کے مسائل کے لیے کوئی پیچیدہ قانون نہیں بلکہ عقل کے احکام کافی تھے۔ سلطنت بڑی چیز ہے خواہ ایک شہر کی بھی کیوں نہ ہو۔ سیاسی بیباک دماغ کو چکرا دیتا ہے۔ وہاں یہ معمولی پیش پا افتادہ اصول بے کار ہو جاتے ہیں کہ اہلِ حسد کی نہ سنو اور انصاف کرو۔ فلسفۂ سیاست اور قانون کی کتابیں پڑھیے تو معاشیات کی کتابوں سے واضح ہوگا۔ جن مسائل کے لیے افلاطون وارسطو نے عالمانہ کتابیں لکھیں۔ وہ مورد اعتراضات ہیں۔ اس سیاست کے لیے ہندوستان شیر اور گیدڑ کی کہانی لے کر آگے بڑھتا ہے۔ یہ مضحکہ خیز ہے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی یوں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ مضحکہ خیز صورتِ حال اس وقت پیدا ہوئی ہے۔ جب ہم سادہ زندگی کے مسائل کو خود اپنے معاشرے میں تلاش کرنے لگتے ہیں اور ان قصے کہانیوں کو ان کی اصلی فضا اور زمانی قید سے آزاد کرکے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شعوری کوشش جو قصوں کو ان کے سیاق و سباق اور سماجی پس منظر سے الگ کرتی ہے۔ اس سے ہم ان کہانیوں کی اس حیثیت اور اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو انہیں قدیم زمانے میں حاصل تھی۔ کرشن کے وہ اقوال دیکھیے جو وہ ارجن کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ کوٹلیہ کا ارتھ شاستر دیکھیے جس میں موریہ خاندان کے لیے فلسفۂ سیاست موجود ہے۔ ان کتابوں میں بھی زندگی اپنی سادہ صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ یہاں بھی زندگی کے بارے میں وہ مقولے ہیں جو موجودہ حالات میں ناقابلِ عمل ہیں۔ یہاں بھی واقعات کے رشتے حالات کی گونا گونی

سے متعلق نہیں بلکہ ان کا حل انفرادی غور و فکر، قدیم اخلاقی اقدار اور بعض مذہبی تصورات پر منحصر ہے۔ اخلاق ہندی بھی ارتھ شاستر کے اسی رجحان کی پیداوار ہے۔ ہند و پاکستان کی قدیم تمدنی زندگی میں ایسے کئی دور آئے ہیں جب طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ آریاؤں کی آمد اور پنجاب میں ان کا قیام، سکندر کے حملے سے قبل کی سیاسی حالت، موریہ خاندان کے زوال کے بعد کی افراتفری، یونانی قبائل کی یورش، وحشی اقوام کی شہر بہ شہر راج دھانیاں، مسلمانوں کی آمد سے قبل کی سیاسی بدامنی — یہ سب وہ مواد ہے جو ہماری قدیم کہانیوں میں بالواسطہ موجود ہے۔ ان کہانیوں نے بہت کٹھن مواقع پر انسان کو نسخۂ اخلاق دے کر سہارا دیا، اُسے زندگی بسر کرنے کا گر سکھایا، اُسے بُرے حالات کے لحاظ سے میں انفرادی استعداد کے سہارے اپنا راستہ بنانے کا درس دیا۔ پاک و ہند کی تاریخ کے نازک ادوار میں جب شہر شہر الگ حکومتیں اور قریہ قریہ بادشاہتیں تھیں۔ وہاں وہ فلسفہ اخلاق اور وہی فلسفہ تاریخ کا کام دے سکتا تھا۔ جو اس فضا سے ہم آہنگ ہو۔ ہندو دیوما لا نے دیویوں اور دیوتاؤں کے روپ میں فرد کی جبروت اور اس کی بے پناہ قوت تخریب کا اظہار کر رکھا تھا۔ خود مختار راجا اور بارسوخ امیر بھی اسی فضا کے پروردہ تھے جہاں حکومت چلانے کے لیے بدھو فرماں روا کو دانش ور برہمن ملتا تھا۔ جہاں کشتری اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر حکومت بھی کرتا تھا اور رعایا پر ظلم بھی ڈھاتا تھا۔ ایسے میں دانش ور برہمن معاشرے کے فساد کو روکتا تھا۔ انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کا قلع قمع کرتا تھا اور راجا کو نیکی اور خیر کا پیغام دیتا تھا۔ آمرانہ فضا میں جہاں راجہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ تقدیر کا حکم رکھتا ہو وہاں نہ کوئی نصیحت برملا کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی تلقین ہی کارآمد ہو سکتی ہے اس لیے راجا کے بیٹے کو اخلاقی تربیت دی جاتی تھی۔"

شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں کے صفحہ ۴۹۰ پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی جانوروں کی کہانیوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جانور آدمیوں کے سے کام کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال کلیلہ و دمنہ ہے۔ شیر، بیل گیدڑ کی کہانی یا زاغ و بوم کی لڑائی میں کون سی بات ہے جس سے افراد کا جانور ہونا ظاہر ہو۔ باقاعدہ دربار لگتا ہے۔ قاضی کے یہاں دارالقضاۃ ہے زندان ہے، مقدمے چلتے ہیں۔ مجلس شوریٰ منعقد کی جاتی ہے۔ مصنف کے دماغ میں انسانوں کی بستی ہے، انسانوں کی حکومت ہے۔ دمنہ مکار اور دغا باز امیر ہے، کلیلہ راست گو راست باز ہے جو دنیا کے جھمیلوں سے علیحدہ رہنا چاہتا ہے۔"

(شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں صفحہ ۴۸۹)

آخر میں ہم استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی کے ان الفاظ کو درج کرتے ہوئے اس پیش لفظ کو تمام کرتے ہیں کہ—

"اخلاق ہندی اخلاقیات کی کتاب ہے۔ اس میں واقعات کی اپنی جداگانہ حیثیت کوئی نہیں ہے۔ ہر واقعہ ایک کھونٹی ہے جس پر جابجا اخلاقی اقوال کو لٹکا دیا گیا ہے۔ ہر کہانی آخر میں آکر کسی نہ کسی اخلاقی نکتے کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ کہانیاں اکثر سیاسی زوال کے ادوار ہی کی پیداوار ہیں۔ اس لیے یہ داستانیں معاشرے کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ جب انسان کو باہر کی دنیا میں کوئی سہارا نہیں ملتا تو وہ اپنے من میں جھانکتا ہے۔ اور خارج کے مقابلے میں ایک داخلی حل تلاش کرتا ہے۔ یہ کہانیاں اسی طرح کا حل ہیں انسان کو بدی کے ادوار میں نیکی کی شدت سے تلاش ہوتی ہے اور جب مکاری کا بازار گرم ہو تو نیکی کی فتح اور اس کی اہمیت کی جستجو رہتی ہے۔ قدیم آریائی تصورِ زندگی سے یہ بات اس لیے بھی ہم آہنگ ہے کہ کائنات انسان کے لیے درسِ زندگی اور ذہنی تکمیل روحانیت بھی ہے۔ انسان مناظرِ قدرت سے روحِ کائنات کا سراغ لگاتا ہے۔ چرند پرند اُسے زندگی کے حقائق اور روحانی تخیل کے خارجی مظاہر دکھائی دیتے ہیں ویدانت میں آکر کائنات کا یہ روپ اپنی ارضی جنت کھو دیتا ہے اور پھر زندگی، طلسم و سیمیا یا مایا ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن عملی زندگی میں یہی مظاہرِ قدرت اور اس دنیا میں بسنے والے چرند پرند انسان کو درسِ اخلاق دینے لگتے ہیں۔ اس حیثیت سے یہ اخلاقی کہانیاں حد سے بڑھی ہوئی روحانیت کے مقابلے میں دنیاداری کا ایک اقرار ہی نہیں "ترکِ دنیا" یا "تیاگ" کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہیں۔ یہ نفس کشی اور تیاگ سے نروان کی تبلیغ نہیں کرتے، دنیا میں رہ کر جانوروں سے زندگی کے گر سیکھ کر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتے ہیں۔ اخلاق ہندی بھی اسی دنیاوی توازن اور اخلاقی طرزِ بود و باش کا درس دیتی ہے۔

اخلاق ہندی کی زبان ایک دوسری ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ یہ زبان باغ و بہار کی زبان کی طرح چاق و چوبند اور تخلیقی ادب پارے کا درجہ نہیں رکھتی۔ لیکن اس میں تدریس کا پہلو باغ و بہار کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔

اور اب پیشِ خدمت ہے میر بہادر علی حسینی کی تصنیف اخلاقِ ہندی کی داستانوں کا انتخاب، اس انتخاب میں ہم نے تلخیص سے کام نہیں لیا۔ ہر کہانی اپنی جگہ پر مکمل ہے اور پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس میں صرف وہ کہانیاں حذف کی گئی ہیں جو ہم پنج تنتر کے باب میں اس سے پہلے اردو نثر کی داستان میں درج کر چکے ہیں۔

پہلی حکایت مترلابھ کی یعنی فائدہ جو یاروں سے یاروں کو حاصل ہو

بشن سرما پنڈت کہنے لگا کہ اب دوستوں کے ملاپ کی باتیں کہتا ہوں۔ جو لوگ بے مقدور، دانا، مفلس اور دوست ہیں، سو وے اپنا کام ان چار جانوروں کی طرح کرتے ہیں۔ راجا کے بیٹوں نے پوچھا "وہ کیوں کر ہے؟ اس کا بیان جدا جدا کرو۔"

لگ پتنگ کوّے اور چڑی مار کی داستان

پھر پنڈت بولا کہ گوداوری ندی کے کنارے بڑا سا ایک سیمبل کا درخت تھا، اس کے گرد و نواح کے تمام پرندے رات کو اس پر بسیرا لیا کرتے۔ ایک روز منہ اندھیرے لگ پتنگ کوّے کی آنکھ کھلی، دیکھتا کیا ہے کہ ایک چڑی مار کاندھے پر جال دھرے ملک الموت کی صورت بنائے چلا آتا ہے۔ یہ اپنے دل میں اندیشہ کرنے لگا کہ آج بڑی فجر کے وقت صورتِ منحوس نظر آئی ہے، دیکھا چاہیے کیا ہو یہی کہہ کر اس شکاری کے پیچھے لگ گیا۔ آخرش کچھ ایک آگے بڑھ کر شکاری نے ٹوٹے چاول جھولی سے نکال کر ایک جگہ پر درخت کے نیچے چھٹکائے اور اپنے کاندھے کا جال اس پر بچھا کر آپ ایک گوشے میں چھپ رہا۔ اس عرصے میں چتر گریو نام کبوتروں کا بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ ہوا سے اس میدان میں آپہنچا اور ان میں سے بعضے کبوتروں کی نظر بکھرے ہوئے دانوں پر پڑی تو ہر ایک کو اُن دانوں کے چگنے کی خواہش ہوئی۔ چتر گریو ان دانوں کی خام طمعی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "اے یارو! بھلا تک غور تو کرو، اس جنگل میں دانے کہاں سے آئے؟ اگر یہاں آدمی ہوں تو کہہ سکیے کہ ان کے کھانے کھلانے سے دانے زمین میں گرے ہوں گے، سو تو نہیں، اور یہ چاول جو اس درخت کے نیچے پڑے نظر

آنے ہیں، سو اس میں کچھ فریب ہے۔ اگر تم دانا کھانے کے پیے نیچے اترو گے تو تمہارا احوال اس مسافر کا سا ہوگا جو سونے کی پائل کے پیے چہلے میں پھنس کر بوڑھے شیر کا لقمہ ہوا۔ کبوتروں نے پوچھا۔ "وہ قصّہ کیوں کر ہے؟" چترگریو نے کہا:

حکایت بوڑھے باگھ اور مسافر کی۔

ایک دن میں دکھن کی طرف کسی جنگل میں چرائی کو گیا تھا۔ وہاں دیکھا کہ بوڑھا باگھ منہ کعبے کی طرف کیے مودب ہو کر تالاب کنارے بیٹھا ہے جو کوئی راہی مسافر اس طرف کو ہو کر نکلتا، وہ کہتا کہ میرے پاس سونے کی پائل ہے۔ اس کو میں نے خدا کی راہ میں دیا چاہتا ہوں، جو کوئی لے، میں اُسے دوں لیکن مارے ڈر کے اس کے نزدیک کوئی نہ آتا۔

قضا کار، ایک روز کسی مسافر اجل گرفتہ کو یہ ہوس ہوئی کہ اس زیور کو شیر سے لینا چاہیئے۔ دل میں خیال کیا ایسا مال مفت پھر کہاں ہاتھ آوے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے بخت نے یاوری کی اور طالعوں نے مدد کی۔ یہ سمجھ کر چاہا کہ باگھ کے پاس جاوے، پھر جان کی دہشت سے اندیشہ کرنے لگا کہ ایک دشمن کی میٹھی بات پر بھروسا نہ کیا چاہیئے۔ اگرچہ اس کے نزدیک پائل ہے پر اُسے کیوں کر لوں چناں چہ زہر کے ساتھ ہر چند زہر ملا ہو، تاہم اس میں خطرہ جان کا ہے اور جس برائی میں بھلائی شامل ہو وہ بھی خوب نہیں۔ پھر من میں سوچا جہاں گنج تہاں مار، جہاں پھول تہاں خار، اور زر کے محتاج کو ہر جگہ خوف ہے، اب جو میں ڈر کر رہ جاؤں تو دولت میرے ہاتھ نہ آوے گی۔ آدمی اس کے واسطے کیسی کیسی محنتیں کرتے ہیں اور کیا کیا اذیتیں اٹھاتے ہیں تب وہ ہاتھ آئی ہے۔

آخر یہ سب سوچ بچار کر کے بولا "اے شیر! وہ چیز جو اللہ دیا چاہتا ہے سو کہاں ہے؟ دکھا۔" تب اس نے وہ پائل ہاتھ پسار کے دکھلائی۔ بٹوہی بولا۔ "تو باگھ میں مانس، میرا مانس تیرا ادھار، مجھے تیرا بھروسا نہیں، میں تیرے پاس کیونکر آؤں؟" شیر بولا "تو نہیں جانتا کہ میں نے ماس کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اگر گوشت کی مجھے خواہش ہو تو میں جنگل سے ہرن مار کر کیوں نہ کھاؤں اور تجھے پکڑ کر کیوں نہ کھا جاؤں؟ لیکن میں نے زہد اختیار کیا۔ اب یہ پائل میرے کس کام آوے گی۔ تجھے فقیر دیکھ کر دیتا ہوں کہ مجھے ثواب ہو۔ تم ہرگز خوف اپنے دل میں مت لاؤ، نزدیک چلے آؤ، جیسی میں اپنی جان جانتا ہوں ویسی ہی دوسرے کی۔" راہی نے کہا اتنے آدمی اس راہ سے آ کے گئے، ان کو کیوں نہ دی؟ کہا۔ "غنی کو دینا کیا فائدہ؟ جو زخمی ہوا اسی کو دارو دیتے ہیں، بھلے چنگے کو دوا کھلانی لاحاصل، بھوکے (بھوکے) کو کھلانا موجب ثواب کا ہے۔"

اس گفت گو پر مسافر نے فریب کھایا اور کہا۔ "اے نیک خصال! وہ پائل مجھے دے۔" شیر نے کہا۔ "پہلے تم اس تالاب میں نہا کر میرے پاس آؤ تو میں تمہیں دوں۔" تب وہ غریب زیور کی خوشی سے جلد چہلے میں آیا، آتے ہی دونوں پاؤں چہلے میں پھنس گئے۔ شیر نے دیکھا اب تو یہ دلدل میں پھنس چکا، اٹھ کر آہستہ آہستہ پکڑنے کے واسطے چلا۔ اس نے پوچھا۔ "شیر! تم کہاں آتے ہو؟" شیر نے کہا "تجھے دلدل سے نکالنے کو۔" یہ کہتے ہی گردن جا پکڑی۔ بے چارے بٹوہی نے پکڑتے وقت اپنی عقل پر ہزاروں ملامتیں کیں اور کہنے لگا کہ اگر کوئی کڑوے کدو کی جڑ میں پانی کی جگہ شربت دیوے، تو بھی پھل اس کا کڑوا ہی ہووے۔

جو جاکر پڑو بھاڑ جانیب جیو سوں
نیم نہ میٹھو ہوے سینچ گڑ گھیو سوں

اگرچہ اس نے کتنی ایک باتیں میٹھی میٹھی مجھ غریب کا دل لبھانے کے واسطے کیں لیکن جو کچھ اس کی ذات میں تھا سو نمودار ہوا۔ اگر وہ نیک ہوتا تو بدی ہرگز ظاہر نہ ہوتی، اور ایسا کام کبھی نہ ہوتا۔ چناں چہ گائے سوکھی گھاس کھاتی ہے۔ اور دودھ میٹھا دیتی ہے، لیکن دودھ اس کا بہ سبب گھاس کھانے کے میٹھا نہیں بلکہ وہ اس کی ذات سے میٹھا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ تو مر گیا۔ چترگریو کبوتروں کے بادشاہ نے کہا۔ "اے بھائیو! اگر دانا کھانے کو درخت کے نیچے اترو گے، جیسا کہ اس مسافر لالچی نے اندیشہ نہ کیا، پائل کے لالچ میں اپنی جان مفت برباد دی، ویسا ہی تم بھی ان دانوں کی طمع سے گرفتار ہو کے قدر عافیت معلوم کرو گے۔ اے یارو! میں نے کبھی اس درخت کے تلے دانا پڑا نہیں دیکھا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ تھوڑے کھانے سے، اور بڈھے بیٹے سے، اور سیانی عورت سے جو اپنے خصم کے کہنے میں ہو، اور اس آقا سے جس کو اپنی خدمت کی قوت سے اپنا کیا ہو، اور سوچی ہوئی بات سے، اور جو کام عاقلوں کی صلاح سے ہوا ہو، ان چھ چیزوں سے کبھی زبونی پیدا نہ ہوگی۔ اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو ان دانوں سے ہاتھ اٹھاؤ۔"

جو کبوتر ان میں نادان تھا، اس نے کہا۔ "اے بھائیو! اگر ایسی بات چیت سے ہم ڈریں گے تو دانا کہیں کھانے نہ پاویں گے۔ جہاں کہیں چرائی کو جائیں گے اگر ایسا ہی دغدغہ دل میں لاویں گے تو گویا اپنی روزی کا دروازہ اپنے ہی ہاتھوں سے بند کریں گے۔ میں تو ان دانوں کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔" خیر جب سب کبوتر اس کے کہنے سے درخت کے نیچے آئے، چترگریو بڑا عاقل تھا، اس کے نزدیک کوئی مشکل نہ رہتی اور ہر ایک کو نصیحت کرتا۔ جب سب یار نیچے جا چکے، تب یہ کہا "اب تمہارا بنا میرا اکیلے لطف ہے۔ "مرگ انبوہ جشنے دارد" ساتھ ان کے جو ہو سو ہو۔" آخر وہ اتر کر جلد شریک ہوا۔ چڑی مار نے دیکھا، اب تو سب آ چکے، جھٹ سے جال کھینچ لیا، تمام کبوتر جال میں پھنس گئے۔ تب وے اس نادان کو لعنت و ملامت کرنے لگے کہ ہم اس بے وقوف کے کہنے سے نیچے آئے تو دام میں پھنسے۔ کبوتر نادان ان کے طعن و تشنیع سے ایسا شرمندہ ہوا جو اس کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہی۔ کہا بزرگوں کا قول سچ ہے، "اگر دس آدمی کو ایک مشکل پیش آوے تو ایک آدمی کو نہ چاہیئے کہ مخالفت بن کر اس میں سبقت کرے، جو بھلا ہو تو سب کہیں کہ ہم بھی اس میں مددگار رہتے خدا نخواستہ اگر کچھ اور صورت ہو تو ہر ایک اسی پر گناہ ثابت کرے۔" چترگریو نے کہا۔ "اس وقت ملامت کرنی کیا فائدہ؟"

ملامت روا ہے سلامت کی جب
جو وہ جا چکی ہے ملامت خطا

اے بھائیو! گناہ اور خطا کسو کی نہیں جو کچھ خواہش الٰہی ہے وہی ہوتی ہے۔

قضا کے ہاتھ میں پانچ انگلیاں دو
اگر چاہے کرے بے جاں کسی کو
رکھے آنکھوں پہ دو اور کان پر دو
اور اک رکھ لب پہ وہ بولے کہ چپ ہو

یارو اگر دن برا آتا ہے تو نیک کام بھی بد ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ماں باپ سے زیادہ مہربان اپنے بیٹے بیٹی کے حق میں کوئی نہیں لیکن بعضے وقت ایسا ہوتا ہے کہ وہی ماں باپ اپنے فرزندوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ مثل ہے۔ "گوالا جب گائے کا دودھ دوہتا ہے، تب بچھڑے کے گلے کو گائے کے پاؤں سے باندھتا ہے۔ اسی

وقت وہی پاؤں پھڑوں کی بیڑی ہوتا ہے اور وہ گوالا اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے۔" سنو دوستو! اب شور مت کرو۔ کچھ ایسا اندیشہ کرو کہ موجب ہر ایک کی مخلصی کا ہو۔ یار وہی جو بُرے وقت میں کام آوے۔ فراغت میں ہر کوئی کہتا ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں اگر کسی کو کچھ ضرور کام درپیش ہوا اور اس کے سبب مغموم ہووے تو اس کو لوگ مرد نہیں کہتے بلکہ نامرد مشہور کرتے ہیں۔ مرد وہ ہے کہ جو حادثہ اس پر پڑے تو دل اپنا مضبوط رکھے اور سوچ بچار اس بات کا کرے کہ اس سے اپنا کام سرانجام ہووے قول بزرگوں کا ہے۔

اضطراب ہے عبث کلک قضا نے میرؔ
لکھ دیا ہے جو نصیبوں میں وہی ہووے گا

اب ایسی فکر کیا چاہیئے کہ ہر ایک اس بند سے نجات پاوے کیونکہ عقلمندوں نے کہا ہے کہ چھ چیزیں آدمیوں کو چاہیئیں — پہلی ان میں سے یہ ہے کہ اگر کسی بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو جاوے تو اس سے ہرگز نہ گھبراوے۔ دوسری یہ، جو کوئی کسی کے یہاں بڑا آدمی آوے تو اس کی تواضع کرے۔ تیسری یہ، جو بات مجلس میں کہے سو برمحل کہے۔ چوتھی یہ کہ لڑائی میں دل چلا دے۔ پانچویں یہ کہ، اپنے تئیں خلق کی زبان سے بچاوے اور نیک کہلاوے۔ چھٹی یہ ہے کہ علم کی تحصیل میں دل لگاوے۔

"اور چھ چیزیں مرد کو نہ چاہیئیں۔ پہلے بہت سونا دوسرے عبادت میں کاہلی کرنی، تیسرے ہر ایک کام میں ڈرتے رہنا، چوتھے غصہ کرنا، پانچویں بڑا کہنا پڑوسیوں کو چھٹے غیبت کرنی لوگوں کی اور ہنسنا ان پر۔ اب اے بھائیو! میرے اتفاق سے کام کرو اور میری بات کو سنو تو تمہاری مخلصی ہووے۔"

کبوتروں نے کہا "اے بادشاہ! جو پہلے تمہارا کہا ہم سنتے، ایسے فضیحت اور رسوا ہوتے اب جو کچھ فرماؤ سو وہ بجا لاویں۔" بادشاہ نے کہا "یارو! جو کسی شخص پر ایک مشکل آپڑے ان میں سے ایک کو نہ چاہیئے کہ ممتاز ہو کر اپنے تئیں نمود کرے، کیونکہ اگر وہ کام خوب ہو تو سب کہیں کہ اس میں ہم شریک تھے جو بد ہو تو سب کہیں کہ فلاں نے یہ کام کیا ہے اب جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن بالفعل سب کبوتر ایک دل ہو کر ایک بارگی جال سمیت اڑو۔ چنانچہ ایک گھاس کے تنکے سے جو ایک پرند کو باندھیں تو زور سے اس طائر کے وہ تنکا ٹوٹ جاوے۔ اگر ویسے ہی بہت سے تنکے ایک جگہ کرکے رسا بنائیں تو اس سے ہاتھی بندھتا ہے، ہرچند ہاتھی زور کرے پر ہرگز نہ توڑ سکے۔

غرض جو اس نے کہا، سو انہوں نے کیا یعنی سب زور سے جال لے اڑے اور چڑی مار نے کئی کوس تک پیچھا ان کا کیا۔ جب وے نظر سے غائب ہوئے تب وہ ناامید ہو کر پھر گیا کبوتروں نے کہا "اے بادشاہ! شکاری نے ہمارے گوشت کھانے سے ہاتھ دھوئے اب کیا کیا چاہیئے؟" چترگریو بولا "یارو! دنیا میں ماں باپ درد کے شریک ہیں کیونکہ وے اپنے دل سے دوست ہیں اور لوگ کسو سبب سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت وے کہاں ملیں! پر ایک میرا دوست ہرنک نام چوہا گندک ندی کے کنارے چتربن میں رہتا تھا۔ کبوتروں کو دیکھ کر چپ رہا پھر اپنے دوست کو پہچان کر کہنے لگا۔ "اوہو! میں بڑا نیک بخت ہوں جو میرے گھر پر میرا یار چترگریو آیا۔" پھر دیکھا کہ سب کبوتر ایک جال میں پھنسے پڑے ہیں، ایک لحظہ چپ رہ کر کہنے لگا "یار یہ کیا حال ہے؟" چترگریو بولا "میں کیا کہوں؟ ہمارے گناہوں کا یہ نتیجہ ہے۔ تم دانا ہو کے یہ کیا پوچھتے ہو؟" چوہا کہنے لگا۔ "جس شخص کو جہاں کسی سبب سے جو کچھ ہونا چاہیئے سو ہوتا ہے، چنانچہ دکھ، سکھ، خوشی ناخوشی، ہر ایک کو اپنے اپنے گناہ اور نیکی کے موافق ملتی ہے۔" یہ کہہ کر چوہا چترگریو کی طرف کا پھندا کاٹنے دوڑا۔ وہ بولا۔ "ایسا نہ چاہیئے، پہلے میرے رفیقوں کی گرہ کاٹو تیس پیچھے میری"۔ چوہا بولا۔ "دانتوں میں قوت کم ہے، کیونکہ سب کے پھندے کاٹ کر تمہارا پھندا کاٹوں گا؟" پھر چترگریو نے کہا۔ "پہلے انہیں کا جال کاٹو۔" ہرنک بولا "اپنے تئیں ہلاکت میں ڈال کر دوستوں کو بچانا خوب نہیں، بزرگوں نے کہا ہے۔ مال کو اور دوستوں کو واسطے دفع بلیات کے رکھتے ہیں، یعنی جان کو دولت اور نواحقوں سے بچاتے ہیں۔ اپنی جان کی محافظت ہر ایک شے پر مقدم جاننا چاہیئے کیوں کہ اس کے سبب دین و دنیا کا کام انجام پاتا ہے۔" چترگریو بولا "اے دوست! تو جو کہتا ہے سو دنیا کا یہی دستور ہے لیکن میں اپنے نواحقوں کا دُکھ دیکھ نہیں سکتا۔ آگے بھی لوگ کہہ گئے ہیں کہ دانا غیر کے واسطے جان اور دولت دیتا ہے۔ پس غیر کے لیے اپنی دولت اور زندگی سے ہاتھ اٹھانا مناسب ہے اور یے سب ذات اور زور میں میرے برابر ہیں۔ پس میری بزرگی سے فائدہ ان کو کیا ہوگا؟ بغیر اجرت کے میری رفاقت میں رہتے ہیں، اس میں اگر میری جان جاوے اور ان کی مخلصی ہووے تو مجھے قبول ہے، کیونکہ اس جسم فانی کا کچھ اعتبار نہیں۔ جو اس سے دنیا میں بھلائی ہووے تو بہتر ہے، کس واسطے کہ وہ تو ایک دم میں فنا پذیر ہے اور یہ ہزاروں برس رہتی ہے۔" یہ بات ہرنک سن کر بہت خوش ہوا اور کہا "صد آفرین تم کو کہ اپنے رفیقوں پر تمہارا یہاں تک موہ ہے۔" غرض ہرنک چوہے نے ہر ایک کبوتر کے پاؤں کے پھندے کاٹ کر تعظیم و تکریم سب کی کی۔ پھر چترگریو کی طرف متوجہ ہو کر کہا "سن یار! جال میں گرفتار ہونے کا افسوس نہ کرنا ہرج مرج سب پر یوں ہی ہوتا چلا آتا ہے۔" بولا "اگر ہم دانا ہوتے تو جال میں چڑی مار کے نہ پھنستے۔" ہرنک کہنے لگا۔ "دیکھو کرگس نزدیک آسمان کے اڑتا ہے اور تکا گوشت کا جو دیکھے تو اسی وقت نیچے آتا ہے۔ اگر کسو نے وہاں جال بچھایا ہو تو کیا جانے؟ کیوں کہ خدا کے کام میں عقل ضعیف کا کیا مقدور جو دخل کر سکے، روز بد کی تاثیر ایسی ہے کہ چاند سورج چاہیں کہ اپنے تئیں گہن سے بچا دیں تو بچا نہیں سکتے۔" ہرنک نے دو چار باتیں نصیحت اور دلاسے کی کر کے بہمانی کھلا پلا کے وداع کیا اور دونوں یار آپس میں بغل گیر ہو کر آنکھیں بھر لائے اور چوہے نے مخدوم شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا۔

(ترجمہ) چشم و دل سعدیؔ کے تیرے ساتھ ہیں
جانیو تو مت کہ تنہا ہوں چلا

چترگریو بادشاہ کبوتروں کا لشکر سمیت اپنے ملک کی طرف چلا اور ہرنک اپنے بل میں گھسا۔

پھر وہی لگ پتنگ کوا جس کا مذکور پہلے ہوا اور اس چڑی مار کا منہ، منہ اندھیرے دیکھ کر ساتھ لگ لیا تھا۔ اس نے تمام احوال (جو کبوتروں پر گزرا تھا) دیکھا تو حیران ہو کر کہا سبحان اللہ! دیکھو تو محبت اور دوستی میں کتنا بڑا فائدہ ہے کہ کس بُرے وقت میں یار کے کام آیا۔ جیل کیچڑ میں پھنسے کو چاہیئے ہاتھی قوی یار درماندے کی کرتا ہے مدد یار ولی وہ کوا چوہے کے بل کے پاس آیا اور نرم نرم آواز سے کہنے لگا۔

"اے ہرنک! میں نے اتنا سفر کیا ہے لیکن تم سے یار و غمخوار دنیا میں کہیں نہیں دیکھا میری ایک عرض ہے جو قبول کرو تو کہوں؟" جب چوہے نے آواز کوے کی سنی تو سوراخ سے بولا "تو کون ہے اور کہاں سے آتا ہے؟" کہا "میں لگ پتنگ نام کوا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ تم سے دوستی کروں۔" چوہا بولا "میں چوہا تو کوا، میں تیری خوراک، تو میرا کھانے والا۔ پس ہماری تمہاری دوستی کیونکر بن پڑے؟ جاؤ کسی کوے یا کسی اور پنچھی سے دوستی کرو۔ اگر میں تم سے دوستی کروں تو وہ مثل ہو جیسا کہ گیدڑ اور ہرن میں بسبب یاری کے ہوئی۔" کوے نے پوچھا کہ ان کا قصہ کیونکر ہے؟ چوہے نے کہا۔

• حکایت مبتدا کوے اور ہرن اور چھدر بدھ گیدڑ کی۔ "میں نے سنا ہے کہ پورب

کی طرف گنگا کے کنارے چنپاوتی نام ایک نگری ہے۔ اس کے نزدیک ایک جنگل ہے اُس میں ایک کوا اور ہرن دو یار جانی رہا کرتے تھے۔ ہرن خوب تازہ توانا تھا۔ ایک گیدڑ اس کے مٹاپے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دل میں اپنے ٹھہرایا کہ پہلے اس ہرن سے رہ و بازی کیا چاہیے، تس کے پیچھے اس کے گوشت سے اپنی داڑھ کو گرم کیجیے۔ یہ نیت کر کے ہوتے ہوتے ہرن کے پاس آیا اور کہا "السلام علیک اے ھرن با خیر و عافیت؟" ہرن بولا "تو کون ہے؟" کہا "میں گیدڑ ہوں، نام میرا چھُدر بدھ ہے، اس جنگل میں بغیر دوست کے جیوں (جوں) مردہ پڑا رہتا ہوں۔ اب تم سے جو ملاقات ہوئی ہے تو اپنے تئیں میں نے جیتوں کی دفع میں شمار کیا اور جانا کہ اب میرے قالب میں جان آئی۔"

اسی گفت گو میں تھے کہ سورج کے کانتے دریائے نیل سے اڑ کر کنارے میں جا غوطہ مارا اور پیچھے سے بانہ کالی رات کا نمودار ہوا۔ ہرن جہاں رات کو رہتا تھا وہاں گیا۔ گیدڑ بھی اس کے پیچھے لگا ہوا اس کے ڈیرے تک (ٹک) چلا گیا۔ وہاں ایک درخت چنپا کا تھا اور ایک سبدھ نام کوا ہرن کا قدیم دوست تھا۔ دیکھتے ہی بولا "اے یار! یہ دوسرا کون ہے جو تم اپنے ساتھ کر لائے ہو؟" کہا "یہ گیدڑ ہے اور نیک ذات معلوم ہوتا ہے۔ مجھ سے دوستی کیا چاہتا ہے۔" کوے نے کہا۔ "جس سے کہ آشنائی نہ ہو اس کی بات کو یک بیک نہ سنا چاہیے اور اپنی جگہ میں رہنے نہ دیجیے۔ مگر تو نے بات اس کرگس اور بلی کی نہیں سنی؟" اس نے پوچھا۔ "وہ کیوں کر ہے؟"

کوے نے کہا۔

نقل ایک گدھ اور بلی کی

میں نے یوں سنا ہے کہ بھاگ رتی ندی کے کنارے ایک پہاڑ ہے۔ اسے گردکوٹ کہتے ہیں۔ اس پر ایک بڑا درخت سیمبل کا تھا۔ اس کے ایک کھوڑ میں ایک بوڑھا ضعیف گدھ برسوں سے رہا کرتا تھا۔ اس کے پر و بال میں اتنی طاقت نہ تھی جو کہیں ادھر ادھر کھانے پینے کے واسطے جایا کرے، لیکن اکثر پرندے جو اس درخت پر رہا کرتے تھے، ہر ایک جانور کھانے کی چیز اس کے لیے اپنی چونچ میں لایا کرتا تھا۔ اسی صورت سے کرگس اپنی گزران ہمیشہ کرتا تھا۔

ایک دن ایک بلی اس تاک پر وہاں آئی کہ ان جانوروں کے بچے کھایا چاہیے۔ بچوں نے اسے دیکھ کر شور ڈالا۔ گدھ کو بڑھاپے کے سبب آنکھوں سے سوجھتا تھا۔ بچوں کا غل غش کر اس خوف سے سر نکالا اور کہا "تم کون ہے؟ جو یہاں چلا آیا ہے؟" بلی نے جو کرگس کو دیکھا تو ڈری کہ یہ جانور ہیبت ناک ہے اپنے دل میں کہا کہ اب میں ماری گئی کیونکہ جگہ بھاگنے کی نہ رہی۔ پس یہی بہتر ہے کہ اس کے نزدیک جا کر کچھ بات بنایئے کہ دل اس کا فریفتہ ہو۔ آہستہ آہستہ کرگس کے پاس آ کر سلام کیا۔ اس نے پوچھا "تو کون ہے؟" اس نے عاجزی سے کہا "میں غریب بلی ہوں۔" کہا۔ "اگر تو بلی ہے تو یہاں سے جلد بھاگ۔ نہیں تو میں ہوں بھوکا، تیرا لہو پی جاؤں گا۔" اُن نے کہا "میں ایک بات تم سے کہتی ہوں۔ جو مارنے کے قابل ہوں تو مجھے مار ڈالیو اور نہیں تو چھوڑ دیجیو۔" وہ بولا "جو تیرے دل میں ہو سو ظاہر کر۔" بولی کہ "سنو صاحب! بد ذات اور نیک ذات قول و فعل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے۔ جو سب کہتے ہیں کہ بلی جانور کی مارنے والی اور ماس ادھاری ہے۔ اگر یہ بات دل میں لا کر مجھے مار ڈالو تو تمہاری بزرگی معلوم ہوئی۔ پر شاید تم نے میرے زہد کا احوال کسو سے نہیں سنا کہ میں بغیر اشنان کچھ کام نہیں کرتی ہوں اور گوشت کھانا بالکل جانوروں کا چھوڑ دیا ہے کہ اپنی اور دوسرے کی جان برابر جانتی ہوں، خدا کی بندگی میں رہتی ہوں اب یہ عاجزہ تمہاری خدمت میں آئی ہے۔ جب یہاں سے اکثر جانور دانہ چگنے کے واسطے گنگا کے کنارے جاتے تھے۔ ان کی زبانی آپ کے اوصاف سن کر دل اس عاصی کا نہایت راغب ہوا کہ ایسے بزرگ کے قدم دیکھا چاہیے، کہ جتنے گناہ اپنے میں ہوں سو دور ہو جاویں۔ اس نیت سے آپ کے قدم آ دیکھے ہیں، اور تم میرے مارنے کا قصد رکھتے ہو۔ ایسا کسو نے نہیں کیا جیسا تم کیا چاہتے ہو۔ اگر کوئی کلہاڑی ہاتھ میں لے کر درخت کاٹنے کے واسطے آتا ہے اور وہ اس کی چھاؤں میں بیٹھتا ہے۔ درخت اپنی بڑائی سے چھاؤں اس کے سر سے دور نہیں کرتا۔ میں تیری ملاقات کے واسطے اتنی راہ طے کر کے آئی ہوں اور تو چاہتا ہے کہ مجھے مار ڈالے؟ اگر مہمان کسی کے گھر جاتا ہے، جو صاحب خانہ مہمانی نہیں کرتا تو تیری طرح کڑوی بات بھی نہیں کہتا۔ اگر بہت مدارات نہیں کرتا بھلا تھوڑا ٹھنڈا پانی پلاتا ہے اور میٹھی بات تو کہتا ہے۔ جہاں کہیں صاحب درد ہے، اگر اس کے پاس کوئی ہنر مند یا بے ہنر جاتا ہے تو دونوں پر برابر نظر رکھتا ہے جیسا کہ آفتاب اپنی شعاع سے کسی کو محروم نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کرتا کہ بڑے آدمی کے گھر پر اجالا کرے اور چھوٹے آدمی کے گھر پر اندھیرا۔"

جب دل کرگس کا اس کی باتوں سے نرم ہوا تب کہا "اس درخت پر جانوروں کے بچے ہیں، تو اس واسطے احتیاط کے اتنی تجھ سے باتیں کہیں، اپنے دل میں کچھ نہ لانا۔" بلی دونوں ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر کہنے لگی "استغفراللہ! یہ بات تو نے کہی، اگر کوئی اور کہتا تو میں اس پر زہر کھاتی کیوں کہ میں نے بہت علم کی کتابیں پڑھی ہیں اور خدا کی راہ خوب معلوم کی ہے اور عالموں، فاضلوں اور ریشی راروں سے سنا ہے کہ کسی کا دل آزردہ کرنا گناہ کبیرہ ہے جو کوئی جانور کو مار کر اس کا گوشت کھاوے، جب تک (ٹک) وہ اس کی زبان پر ہے، تب ہی تک مزہ پاوے۔ جب حلق کے نیچے اترا تو کچھ نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ وہ غریب اپنی جان سے جاتا ہے اور جان اس کی کس مشکل سے نکلتی ہے۔ بھلا اس میں کیا لطف ہے؟ یہ نہیں جانتا کہ کل کو حساب دینا ہوگا اور اس کے جواب سے کیوں کر عہدہ برآ ہوگا؟ حیوان کو اذیت دینے کو اور چیونٹی کی جان مارنے کی سزا اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ پس چاہیے کہ اپنی جان سے چیونٹی کی جان کو بہتر جانے کیونکہ مرنا برحق ہے۔ جب تک ہو سکے بدی نہ کرے۔"

بلی کی کچھ فریب باتوں نے دل گدھ کا ملائم اور نرم کیا۔ خیر بعد اس جواب و سوال کے وہ بلی وہاں رہنے لگی۔ دو ایک دن وہ کر یہ مکار رہتے ہوتے جا کر دو تین بچوں کو پکڑ لائی۔ کرگس بچوں کی آواز سن کر بولا "ان بچوں کو تو کیوں لائی ہے؟" کہا "میرے بھی دو تین ایک لڑکے ہیں۔ بہت دن ہوئے میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ میرا دل ان میں لگ رہا ہے، اکثر ان کو یاد کر کے روتی ہوں، اس واسطے انہیں لائی ہوں کہ جوان کی جگہ ان کو دیکھ کر میرا دل پیچھے پڑے۔" گدھ نے جانا بلی سچ کہتی ہے اور بلی نے ان بچوں کو لا کر کھا لیا۔ پھر اسی طرح سے ایک ایک دو لاتی اور کھاتی تھی۔ یہاں تک کہ سب کو تمام کیا اور اپنی راہ لی۔

جب سب پرندے اس درخت کے رہنے والے اپنے اپنے گھونسلے میں آئے تو بچوں کو تلاش کرنے لگے کہ ہمارے بچوں کو کون لے گیا؟ جب بہت سی جستجو کی تو بچوں کی کچھ ہڈیاں درخت کے نیچے اور کچھ گدھ کے کھنڈ سلے میں پائیں، تب تو سب کو یہی یقین ہوا کہ بچوں کو اسی گدھ نے کھا لیا ہے۔ اپنی کوکھ کی آگ سے ہر ایک جانور بے تاب ہو کر اس گدھ کو مارنے لگا۔ یہاں تک چونچیں ماریں کہ اس بے چارے کو مار ہی ڈالا۔

یہ کہہ کر کوے نے کہا "اے ہرن! غیر آشنا کو اپنے گھر میں راہ دینے سے

یہ فائدہ ہوتا ہے۔" گیدڑ یہ بات سن کر خفتے ہوا اور بولا۔ "اے کوّے! تیرا سبدھ نام ہے پر تجھ میں کچھ عقل نہیں ہے کیونکہ کوئی شخص دوستی ماں کے پیٹ سے نہیں لے نکلتا۔ پہلے جب تجھ سے اور اس ہرن سے ملاقات ہوئی تھی، نہ تو اسے پہچانتا تھا، نہ وہ تجھے جب تم دونوں ایک جگہ رہنے لگے تو روز بروز دوستی زیادہ ہوئی، جو اچھے لوگ ہیں وے سب کو دوست جانتے ہیں، یہ کام منافقوں کا ہے جو کسی کو دوست اور کسی کو دشمن جانے۔ ہم ایک ہی گھر کے غلام ہیں، جیسا کہ ہرن میرا دوست ہے ویسا ہی تو بھی بلکہ اس سے بہتر ہے!"

پھر ہرن بولا۔ "اے سبدھ! فی الحقیقت ہم سب آپس میں بھائی ہیں، جیسا کہ کلام مجید میں آیا ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ "سب مومن آپس میں بھائی ہیں"[1] اگر یہ گیدڑ چاہتا ہے کہ ہماری صحبت میں رہے تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے؟ جتنے یار آشنا کسی کے زیادہ ہوں تو گویا اس کی دولت زیادہ ہوئی۔" یہ سن کر کوّے نے یہ مصرع پڑھا۔

یار جانی کی خوشی گر اس میں ہے تو خوب ہے

اسی گفتگو میں رات کٹ گئی، چاند چھپ گیا اور سورج نکل آیا۔ تینوں یار کوّا، گیدڑ، ہرن اپنی اپنی چرائی کی جگہ جاتے۔ ہر روز اسی طرح ایک طرف سے چر چگ آتے اور ایک جگہ میں آکر سو رہتے۔ یوں اوقات بسری کیا کرتے۔

ایک روز شغالِ بدباطن (جو ہرن کے گوشت پر دانت لگا رہا تھا) ایک جو کا کھیت ہرا تازہ (کہ جس میں کسان نے ہرن پکڑنے کے واسطے کَل لگائی تھی)، دیکھ کر دوڑا آیا۔ ہرن کو ایک طرف لے کر کہا: "سن یار! تو سوکھی گھاس کھاتا ہے مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، مجھے کمال قلق رہتا ہے۔ آج ایک جو کا ہرا کھیت تمہارے لائق دیکھ آیا ہوں۔ اور خاطر جمع سے بے کھٹکے چرو تو دل میرا ٹھنڈا ہو۔ اور آنکھیں روشن؟"

فجر ہوتے ہی دونوں چلے۔ جب کھیت کے نزدیک پہنچے، گیدڑ بولا "جاؤ جی بھر کے کھاؤ۔" ہرن بیٹے کا اندھا۔ کھیت کی ہریاول دیکھ بے تامل دوڑا اور بے اندیشے کھانے لگا، اسی وقت پھندے میں پھنس گیا۔ گیدڑ بدذات دل کی خوشی سے لگا ناچنے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو لگا دے دے مارنے۔ آہو نے جانا کہ میرے گرفتار ہونے کے سبب اپنی جان کھوتا ہے۔ یہ نہ جانا کہ "صوفی دسترخوان کو دیکھ کر کودتا ہے"۔ ہرن بولا۔ "اے یار! میرے واسطے کیوں اپنے تئیں ہلاک کرتا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں جو تمہارے دانت فضلِ الٰہی سے تلوار کی دھار سے بھی تیز ہیں؟ اس پھندے کی رسی کو کیوں نہیں کاٹ ڈالتے ہو؟" گیدڑ بولا "اے میری آنکھوں کے تارے! بسر و چشم حاضر ہوں لیکن آج میں نے روزہ رکھا ہے اور یہ دام چمڑے کا، جو دانت لگاؤں تو روزہ مکروہ ہوگا۔ شب درمیان ہے، کل صبح کو جو کچھ اپنی نجابت ذاتی کے موافق ہوگا، آپ کی خدمت سے قصور نہ کروں گا۔"

رات تو یوں گزری، جب فجر ہوئی، اس سبدھ کوّے نے اپنے یارِ قدیم ہرن کو نہ دیکھا۔ دل میں اندیشہ کیا کہ آج رات میرا یار مکان پر نہیں آیا، مجھے یہ آثار بھلائی کے نہیں نظر آتے۔ دیکھیں تو کیا صورت ہے! یہ کہہ کر ہر طرف ڈھونڈنے لگا۔

دیکھتا کیا ہے کہ ایک جگہ دام میں ہرن گرفتار ہے۔ اپنا سر زمین سے دے مارا۔ اور آہ مار کر کہنے لگا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ یہ گیدڑ بدبخت شریر ہے۔ جو کوئی اپنے یار کا کہا نہ کرے، یہی خرابی کا دن اس کے آگے آتا ہے۔ اب وہ تیرا یار گیدڑ کہاں ہے؟ کہا۔ "میرے گوشت کا بھوکا یہاں کہیں بیٹھا ہوگا!" بولا۔ خیر جو کچھ ہونی تھی سو ہوئی، اب تئیں (تو) اپنے تئیں مردہ بنا کر دم سادھ جا۔ جب میں بولوں، تب تو اٹھ بھاگیو۔" ہرن نے وہی کیا جو کوّے نے کہا۔ اتنے میں کھیت والا جب اس کے پاس آیا اور دیکھا کہ ایک مرا ہوا ہرن موٹا سا دام میں پھنسا ہے، بہت افسوس کیا: "جو میں اسے زندہ پاتا تو کیا خوب ہوتا! ہوتے ہوئے اس کے گلے کا بند کاٹ کر اسے تفاوت کر دیا اور آپ جال اٹھانے کی فکر میں لگا۔ اس نے چھٹکارا پایا۔ اس میں کوّا بولا تو یہ اٹھ کر بھاگا۔

اس نے دیکھا کہ ہرن چلا گیا۔ ایک کھٹکا اس کے ہاتھ میں تھا، بھاگتے کے پیچھے پھینکا۔ گیدڑ جو وہاں اس کے لہو کا پیاسا دبکا ہوا بیٹھا تھا، اس کے سر میں جا لگا! لگتے ہی یہ تو کھیت میں رہا، وہ سلامت نکل گیا۔ بزرگوں نے کہا ہے "جو کوئی کسی کے واسطے کُوا (کنواں) کھودتا ہے تو وہی گرتا ہے۔"

جس نے اوروں کے لیے کھودا کُوا
ہے یقیں اس میں وہی جا کے گرا

غرض آہو اور کوّا ایک جگہ ہو کر بہت خوش ہوئے۔ کوّا ہرن سے کہنے لگا کہ دشمن کی چال اور مچھر کی ایک جانو۔ اکثر پہلے تو پاؤں پر آ بیٹھتا ہے، پھر پیٹھ پر، ماتس پیچھے کان کے پاس آکر بولتا ہے۔ اگر کھلا بدن پاتا ہے یا کپڑے میں کہیں سوراخ نظر آوے تو وہیں گھس کر لہو پینے کے لیے کاٹتا ہے۔ ایسا ہی دشمن بھی جو سختی نہ کر سکے تو نرمی سے پیش آوے اور پاؤں پر گرے، اور کان میں بات ملائم کہے۔ اور دل میں اپنی جگہ کرے۔ جب رخنہ کہیں پاوے تو اپنا کام کر گزرے۔

الغرض چوہے نے جب قصہ تمام کیا تو یہ بات کہی: "اے زاغ! میں جانتا ہوں تو میرے خون کا پیاسا ہوا ہے۔" کوّا بولا: "تمہارے گوشت کھانے سے میری حیاتِ ابدی نہ ہوگی اور دولتِ بے زوال کچھ میرے ہاتھ نہ آوے گی۔ اس بات کو تم سچ ہی جانو کہ میں اپنے دل و جان سے تمہاری دوستی کا خواہاں ہوں جیسی کہ چتر گریو کے اور تمہارے درمیان محبت تھی۔ کیونکہ میں نے تم سا یار وفادار کس نہیں دیکھا۔ بھلے آدمیوں سے دوستی کرنی بہتر ہے۔ اس واسطے کہ وے خاصیت دریا کی رکھتے ہیں جیسا کہ وہ عمیق ہے۔ ایسے ہی یہ بھی گمبھیر ہیں۔ اگر کوئی آگ دریا میں ڈالے تو وہ ہرگز گرم نہیں ہوتا اور نیک مرد بھی کسی کی بری بات سے ہرگز خفا نہیں ہوتے۔ میں نے تمہارا احوال خوب دریافت کیا۔ تم نیک بخت ہو، تمہاری نیک خصلت پہ میں عاشق ہوا ہوں۔"

چوہا بولا۔ "میں نے تجھے کئی بار کہا ہے کہ میں دوستی تجھ سے کیوں کر کروں؟ میری تیری دوستی گویا آگ پانی کی سی ہے۔ ہر چند آگ پانی کو ہانڈی میں لے کے اپنے سر پر رکھ کر گرم کرتی ہے لیکن وہ اس کی عداوت سے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ جب دونوں اکٹھے ہوئے تو وہ اسے بجھا ہی دیتا ہے۔ اے زاغ! تیرا کیا اعتماد؟ جیسا تو باہر سے کالا ہے ویسا ہی اندر سے۔ میں تیری غذا ہوں، تو جہاں مجھے پاوے کھا وے۔ تجھ سے محبت کا لگاؤ کیوں کر ہو سکے؟"

کوّا بولا: "جو تم نے کہا سو میں نے سنا۔ اب میں نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ تیری ہی رفاقت میں رہوں۔ اگر تئیں قبول نہیں کرے گا تو تیرے دروازے پر اتنے فاقے کھینچوں گا کہ میری جان کی طوطی اس خاک کے پنجرے سے پرواز کرے گی۔ تو بھلا مانس ہے۔ اگر تیرے ساتھ میری دوستی ہوگی تو کبھو تفاوت نہ پڑے گا کیوں کہ مصاحبت رذالے کی کیسی ہے جیسے مٹی کا برتن، ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاوے اور رفاقت اشراف کی مثل ظرف مس کے ہے، کیسا ہی صدمہ پہنچے، تو بھی نہ ٹوٹے، اگر کہیں چوٹ کھاوے

---

[1] کُلّ مومنون اخوۃ۔

تو ہیں درست ہو سکے۔ اے چوہے! اکثر چارپائے جانور کچھ کھلانے سے اپنے ہوتے ہیں اور نادان کم عقل طمع اور حرص سے دوستی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں مرد عاقل اور زیرک ہیں، سو وے بہ سبب نرم دلی کے ملاقات کرتے ہیں اور مہربان ہوتے ہیں۔ اور تو ایسی خوبی رکھتا ہے کہ میں تمام ملک میں پھرا پر تجھ سا یار وفادار میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ تجھ سے ربط دوستی اور رشتہ محبت کا پیدا کروں۔"

چوہے کا دل ان باتوں سے نہایت ملائم ہوا اور اپنے سوراخ سے باہر آیا، ملاقات کر کے کہا: "اے عزیز! تو نے میری جان کے سوکھے درخت میں گویا میٹھا پانی دیا اور میرے دل کو نہایت خوش کیا۔ اب تو میرا یار جانی ہوا، آ تجھ سے بغل گیر ہوں۔" دونوں آپس میں مل کر بہت خوش ہوتے۔ چوہے نے مہمانی اس کی تکلف سے کی۔ جب کھا پی کے فارغ ہوئے تو یہ اپنے بل میں آیا، وہ اپنی جگہ پر گیا۔ پھر وے دونوں یار دن کو آپس میں ہر روز ایک جگہ ہوا کرتے اور چرنے چگنے کے لیے ہر ایک طرف جایا کرتے، پر رات کو ایک مقام میں رہا کرتے۔ اگر کوا کچھ اچھی چیز کھانے کی پاتا تو چوہے کے واسطے اکثر لاتا۔ اسی طرح اس میدان میں اوقات بسری کیا کرتے۔

بعد ایک مدت کے کوا کہنے لگا کہ "یار! اب تو کچھ کھانے پینے کی چیزیں اس اطراف میں نہیں ملتیں، جو ملتی بھی ہیں تو بڑی محنت اور دوڑ سے۔ میں اب یہ چاہتا ہوں کہ یہاں سے دوسری جگہ چلیے اور وہاں چل کر فراغت سے گزران کیجیے۔" ہرنک (ہرنک) چوہے نے اسے جواب دیا کہ "سن یار! بغیر دیکھے اور سنے دوسری جگہ کیوں کر جاویں؟ اقتضا دانائی کا یہ ہے کہ پہلے اپنے واسطے مکان تلاش کیجیے۔ جو خاطر خواہ جگہ ملے تو قدیم مکان کو چھوڑ دیجیے، نہیں تو اسی جگہ بھلی بری طرح سے دن کاٹیے۔"

کوا بولا۔ "ایک مکان میرا دیکھا ہوا ہے، اس کو میں نے ٹھہرایا ہے۔" چوہے نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟" کوا کہنے لگا کہ "ڈنڈکارن ایک جنگل ہے۔ اس میں کاویری ندی اُمڈ سے دکھن کو بہتی ہے۔ منترک کچھوا میرا قدیم یار وہاں بارہ برس سے رہتا ہے، وہاں پہنچ کر جو غذا درکار ہوا کرے گی سو اس سے طلب کیا کریں گے۔ یقین ہے کہ اس کے وسیلے سے خدا ہم کو روزی پہنچایا کرے گا۔" تب چوہا بولا کہ "اگر تمہارا ارادہ مصمم ہے کہ یہاں کی سکونت سے ہاتھ اٹھاؤ تو میں تنہا یہاں کیوں کر رہوں گا، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو اس واسطے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس ملک میں خاوند (خداوند) بینا، اور چرچا علم کا، اور عاقل دوراندیش اور حاکم عادل و طبیب کامل اور دوست جانی نہ ہو وہاں بود و باش اختیار نہ کیا چاہیے۔ چناں چہ اس کے آگے میرا پرانا یار چترگریو کبوتروں کا بادشاہ چلا گیا اور میں یہاں اکیلا رہ گیا۔ اور تس پیچھے میرا یار جو اب تئیں بھی یہاں سے جایا چاہتا ہے، پس ایسے تنہائی کے دن میں کیوں کر کاٹوں گا؟ یارا! اگر تو جاتا ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل۔"

زاغ نے جب چوہے سے یہ احوال سنا، تب آپس میں متفق ہو کر اس ندی پر گئے۔ کچھوا ان دونوں کو دور سے آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آگے بڑھ کر ملاقات کی اور خیر و عافیت پوچھی، کوے نے بھی جواب دیا۔ کچھوا نے کہا۔ "یہ دوسرا تمہارے ساتھ کون ہے؟" زاغ بولا "یہ وہ چوہا ہے کہ جو میرے ہزار زبان ہو تاہم اس کی تعریف نہ کر سکوں اور نام اس کا ہرنک ہے۔" پھر سنگ پشت دوبارہ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔

مثل ہے کہ بڈھا، جوان و لڑکا کوئی ہو، جو اپنے گھر آوے تو اس کی تعظیم و تکریم کرنی ضرور ہے، کیوں کہ مہمان کی بزرگی ہر ایک شخص کے نزدیک ثابت ہے اور یہ کہاوت ہے کہ اگر چھوٹا آدمی بڑے کے گھر آوے تو اس کی بھی تواضع لازم ہے اور چترگریو کا تمام قصہ کہہ سنایا تب کچھوے نے خوب سی ضیافت کی اور بعد کھلانے پلانے کے پوچھا کہ "حضرت سلامت! تم نے اپنی جگہ کو کیوں چھوڑا اور اس بڑے جنگل میں کیوں آئے ہو؟ اس کا سبب بیان کیجیے۔" چوہا کہنے لگا کہ "سن اے ندی کے راجا۔ چندر نام ایک پہاڑ ہے۔ اس کے نیچے ایک بستی بستی ہے۔ اس کا نام چنپاپور اکثر جوگی وہاں رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوراکرن نام جوگی کے گھر میں اپنا بل بنا کر رہتا تھا۔ وہ جوگی ہر روز اس شہر میں بھیک مانگ کر کچا پکا اناج لایا کرتا تھا۔ کھا پی کر جو بچتا تو کوٹھڑی کے اونچے طاق رکھتا اور میں اپنے بل سے سر نکال کر جھانکتا رہتا جب وہ سوتا تو میں سوراخ سے باہر نکل آتا اور اچھل کر طاق پر جا رہتا۔ اچھی طرح خاطر جمع سے کھاتا اور باقی جو رہتا سو اسے ضائع کرتا اور کہیں نہ جاتا، وہیں اپنی زندگی بسر کیا کرتا۔

ایک دن چوراجوگی لاٹھی لے کر میرے بل کے پاس آیا، اس کے منہ کو کھٹکھٹانے لگا۔ اس وقت ایک بنیاکرن نام دوست دار قدیم اس کا اس کے گھر آیا اور یہ اس کھٹکھٹانے کی فکر میں ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ تب وہ بولا کہ میں تمہاری ملاقات کے واسطے آیا ہوں اور اختلاط کیا چاہتا ہوں اور تم میرے ڈرانے کے لیے وہ ہاتھ میں لکڑی لیے بیٹھے ہو۔ تب جورو چوراکرن کی یہ صورت دیکھ کر کہنے لگی کہ آج بنیاکرن مدت کے بعد آیا ہے اس کی تعظیم کر، اس کا احوال پوچھ اور اپنی حقیقت اسی سے کہہ۔ چوراکرن بولا "میری یہ حرکت بے جا نہیں۔ اس بل میں ایک چوہا ہے جو چیز کھانے کی طاق پر رکھتا ہے اور باقی کو رائیگاں کرتا ہے۔" بنیاکرن بولا کہ وہ جگہ تو ذرا مجھے دکھاوے۔ کہا۔ "دیکھو یہی ہے وہ طاق۔" اس نے دیکھ کر کہا کہ وہ اتنا اونچا ہے کہ اس پر بلی بھی زغند نہ مار سکے، اور چوہے کی تو کیا تاب و طاقت کہ اس طاق پر جست کرے، یہ ہرگز بے سبب نہیں۔ شاید اس کے نیچے جہاں وہ رہتا ہے، کچھ نہ کچھ مال ہوگا۔ یہ قوت بغیر مال کے نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک بوڑھے بنیے کی جوان جورو نے اپنے خصم کے لگاتار کئی بوسے لیے۔ یہ حرکت اس کی حکمت سے خالی نہ تھی۔ چوراکرن نے پوچھا "وہ بات کیوں کر ہے؟" بنیاکرن کہنے لگا۔

نقل چندرسین بنیا اور کیلاوتی بنیے کی بیٹی اور منوہر بقال کی

ہندوستان کی کسی سرزمین میں ایک شہر ہے، اس میں چندرسین ایک بنیا بڑا دولت مند (کہ برس سو ایک کی عمر اس کی تھی) رہتا تھا۔ اور ایک نوجوان عورت کسو بنیے کی بیٹی بھی (کہ نام اس کا کیلاوتی تھا) اسی شہر میں رہتی تھی، ایسی خوبصورت کہ اس کے دیکھنے سے چاند سورج بے تاب ہوتے، اور بالوں کی سیاہی سے اس کے حضور ابر شرمندہ ہوتا، اور چشم نرگس شہلا اپنی خلقت کو فریفتہ کرتی اور جادو فریب کمان ابرو اپنی لوگوں کو دیوانہ بناتی اور اپنے دانتوں کی چمک سے بادشاہی جواہرات کو جلا بخشتی۔ یہ بقال مال کی مستی سے اسے اپنے نکاح میں لایا لیکن یہ نہایت بوڑھا تھا اور وہ نوجوان نوخیز تھی۔ اس واسطے بوڑھے خاوند کی محبت سے خوش نہ رہتی۔

ایک دن اس نے ایک جوان خوب صورت بقال بچے کو (جو نام اس کا منوہر تھا) دیکھا، دیکھتے ہی عاشق ہو گئی۔ کہنے لگی کہ سن منوہر! میں جوبن کے دریا

سن ڈوبتی ہوں، میرا ہاتھ پکڑ، اپنے عشق کی کشتی میں اٹھا سکتا ہے کہ نہیں! تب عشق سے بولا کہ ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم سے کسی طرح آشنائی پیدا کروں کیونکہ میرا دل بھی بہت دنوں سے تمہاری محبت کی کمند میں گرفتار ہوا ہے. جب منوہر اور کیلاوتی کا عشق غالب ہوا تب دونوں خلوت میں آئے.... اسی ذوق و شوق میں یونہی ایک مدت گزری.

ایک دن چندرسین بے وقت اپنے گھر میں آیا اس وقت منوہر اس کے گھر میں تھا. کیلاوتی نے دیکھا کہ اب میرا بھید ظاہر ہوتا ہے؟ وہیں چارپائی سے اٹھ کر اپنے گھر کی دہلیز تک دوڑی آئی اور اپنے خصم کے سر کے بال پکڑ پانچ چار چومے بھی اس کے منہ کے لیے اور ہاتھ پکڑ کر ایک گوشے میں لے گئی. منوہر اتنی فرصت میں اس کے خاوند کی آنکھ بچا کر گھر سے باہر نکل گیا. جب اس نے دیکھا کہ وہ جا چکا، تب اپنے شوہر کو دو چار لاتیں مار کر کہنے لگی اے بوڑھے خبیث شہوت نے مجھے اتنی مدت میں آج نہایت بے کل کیا تھا، سو تجھ سے کچھ بھی میرا مطلب حاصل نہ ہوا خفا کر کے پلنگ پر آئی اور سر سے پاؤں تک (ایک) چادر تان کر سو رہی.

تب چوڑاکرن بولا ”جیسا چومنا جوان عورت کا بوڑھے کے منہ کو بے علت نہیں، اسی طرح زور چوہے کی بے سبب نہیں.

الغرض دونوں جوگیوں نے اپنی جیب سے سینہ مٹی نکال کے زمین پر لکیریں نجومیوں کی طرح کھینچ کر معلوم کیا کہ اس چوہے کے سوراخ میں خواہ مخواہ مال ہے، نہیں تو اتنی قوت چوہے میں کہاں سے آتی؟ جس کے پاس دولت ہے اسی کو بہت زور ہے.

بخشی ہے مرد دولت مند خوب
مفلسوں کا دل شکستہ ہے سدا

آدمی کی قدر و قیمت زر سے ہے
مرد جو بے مال ہے کس کام کا

جوگیوں نے کدالی سے اس بل کو کھودا اور سارا ڈھیر روپوں کا وہاں سے نکال لیا. وہ مال میرے بزرگوں کا اور میرا جمع کیا ہوا تھا، انہوں نے وہ سب کا سب اپنے قبضے میں کر لیا. میں نے دیکھا کہ جب میری ساری دولت اپنی کر لی، تب تو مجھے کچھ تاب و طاقت نہ رہی. دہیں مبہوت سا ہو گیا. لیکن چند روز میری زندگی کے باقی تھے، اس واسطے جان عزیز قالب سے جدا نہ ہوئی. اے بادشاہ! ایک تو میرا مال گیا، دوسرے جوگی طعنے مارنے لگے، اس دکھ اور بری باتوں سے میرا دل جل بل کے خاک ہو گیا. ” اسی واسطے اپنی جائے جگہ چھوڑ، اب آپ کے قدموں تلے آ پہنچا ہوں“ کچھوے نے پوچھا ”کہو یار تم کو کیا بات زبوں کہی تھی؟“ کہا: ”اگر یہ مال کسی معتبر پاس ہوتا تو اتنی کفایت اور جزرسی نہ کرتا سر حساب رہتا. یہ چوہا سخت نادان اور احمق تھا جس نے اپنے زور کو ظاہر کیا. مثلاً بزرگ کہہ گئے ہیں، جو کسی کو مال مفت ہاتھ آوے یا اپنے زور بازو سے کماوے اور اسے نہ کھاوے، نہ کسی کو دے، نہ دلاوے تو اس کے جمع کرنے کی محنت ناحق اٹھاوے اور محنت کی اذیت پاوے اور عالم میں شوم بدبخت کہلاوے، بڑی خیر اللہ اس کا کوئی نام نہ لیوے، بلکہ اس کے نام پر مت اٹھ لوگ جوتیاں ماریں اور وہاں کی زمین کو سب کے سب بد کہیں سو ایسی ایسی گفتگو سے اور طعن تشنیع سے مجھ غریب کو ہر روز جلاتے تھے، سو یہ بری باتیں مجھے برداشت نہ ہوئیں:

کچھوا بولا: ”یار! تو اپنے دل کو رنجیدہ مت کر، جیسا دے سے تجھے کہتے تھے کہ شوم کی موت اور حیات دونوں برابر ہیں. عقلمندوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے.

کھانے کے واسطے زر ہے گا اے خلق خوشتر
رکھنے کو سنگ اور زر ہی دونوں ہیں برابر

اے بھائی! خوب ہوا جو تمہارے ہاتھ سے مال جاتا رہا، نہیں تو تمہیں کوئی روپوں کے واسطے مار ڈالتا. بارے شکر خدا کا تم سلامت رہے، مال بہتیرا بھر رہے گا. جس کے یہاں دولت جمع ہو اور وہ اس کے موافق خرچ نہ کرے، یہی اس کے درپیش آوے جو تیرے آگے آیا. چوہے نے کہا: ”کیا تو بھی طعنے دیتا ہے. جوگیوں کی طرح؟ لیکن بے دن مال کے آدمی ناچیز ہے. اگر مال دار نا آشنا کسی کے گھر مہمانی میں جاوے تو لوگ اس کی مدارات حد سے زیادہ کریں. جو غریب مفلس دوستوں کے یہاں جاوے تو اسے خاطر میں نہ لاویں. دولت بہت اچھی چیز ہے. مرد بے زر ہمیشہ زندگی کا زیر زحمت ہے. جب تک آدمی اپنا ہاتھ خرچ کی طرف سے نہ سمیٹے اور جیبوں کی تھیلی پر مضبوط گانٹھ نہ دیوے، ہرگز دولت نہیں رہتی. اے عزیز! جو دیکھا کہ میرا مال و اسباب ظلم سے بدبخت جوگیوں کے ہاں جاتا رہا گھر خالی ہو گیا. ہر کسی طرح دہیں گزران کرنے لگا.

دنیا میں دولت کے برابر کوئی دوست نہیں. بہ منزلہ ماں باپ کے ہے. بلکہ زیادہ، کیوں کہ وہ ہر طرح سے حاجت روا ہے. یعنی بدون اس کے دنیا میں کوئی کام انجام نہیں پاتا. میں نے اپنے دل میں کہا. اب مجھے یہاں رہنا صلاح نہیں اور یہ بات خیر سے کبھی بھی مناسب نہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے. اگر عقل مند ہو. ان تین چیزوں کو حتی المقدور چھپاوے. ایک تو اپنے مال کا نقصان، دوسرے زبونی اپنی عورت کی. تیسرے دل کا دکھ، تم جو میرے دوست ہو اس واسطے اپنا احوال کہا.

جب کودنے کی قوت نہ رہی. ناچار اپنے قدیم مکان کو چھوڑ دیا اور جنگل میں گنگا کنارے رہنے لگا. بارے میں نے خدا کا شکر کیا کہ بالفعل آپ کے دامن دولت کے سائے میں آ پہنچا ہوں. سچ ہے جو کہہ گئے ہیں کہ دنیا زہر کا درخت ہے جس پر حق تعالیٰ کا رحم ہوتا ہے. اس کو پانچ چیزیں میسر ہوتی ہیں. اول ہر روز ترقی علم کی. دوسرے بندگی خدا کی، تیسرے صفائی دل کی، چوتھے سچائی بات کی، پانچویں صحبت بھلے آدمی کی. — اے سنگ پشت! میں بدبخت جوگیوں کے ظلم سے دل گیر نہیں ہوا اصل جو جان سلامت رہی، اور تم سے شرتی کی ملاقات ہوئی تو مال کیا بلا ہے. سب شے مہیا ہو سکتی ہے. دنیا کی دولت کا کچھ اعتبار نہیں. کبھی آتی ہے کبھی جاتی ہے.

کچھوے نے کہا: ”بھائی جو اپنے مال کی زکوٰۃ دلیوے تو اس کے خزانے میں کمی نہیں ہوتی اور کوئی اس میں حرکت نہیں کر سکتا جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے. جو کوئی پانی کو بند کرے اور اس کے نکلنے کی تھوڑی بھی راہ نہ رکھے تو جمع ہو کر باندھ کیسا ہی مضبوط ہو توڑ کر کے سب پانی نکل جاوے. مال کی بھی یہی حالت ہے. جو کوئی محنت سے مال جمع کرے اور اسے نہ کھاوے. اور نہ کسو کو خدا کی راہ میں دلیوے تو اس کی قسمت میں یہی ہے کہ اس کا مال اور کوئی کھاوے.

آپ کھا، اوروں کو دے، کچھ ہاتھ اپنے سے عزیز واسطے اوروں کے بھی کچھ
رکھ لے اے صاحب تمیز:

اے دوست! دولت مند شوم، نگاہ بان مال کا ہے۔ نہ مالک اس کا ہے۔ بلکہ فقیر اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت اس کے ہاتھ آوے۔ سب بے تامل خرچ کرے رات کو بہ فراغت اپنے لڑکے بالوں میں سو رہے اور کسی طرح کا غم و غصہ دل میں نہ لاوے غنی اور بخیل کے تئیں ہر ایک رات کو مال و جان کا ڈر ہی رہتا ہے۔ جادا کوئی دولتوں کی طمع سے جان مار جاوے۔ مگر تم نے کیا اس گیدڑ کی حکایت نہیں سنی؟ چوہا بولا۔ کہو تو یار! اس کا قصہ کیوں کر ہے؟ کچھوا کہنے لگا۔

نقل پرمان نام حاکم اور ارتھ لوبھی گیدڑ کی

کلیان پور نام ایک شہر ہے، اس میں ایک شخص حاکم تھا۔ نام اس کا پرمان، اتفاقاً ایک دن سوار ہو کر شکار کے واسطے کسو جنگل میں گیا۔ جاتے ہی وہاں ایک ہرن خوبصورت سا نظر آیا۔ جلد گھوڑے سے اتر کر اس نے اسے تیر مارا۔ وہ اس کے ہاتھ کا تیر کھاتے ہی تڑپ تڑپ کر گرا۔ اس نے اس کو اپنے کاندھے پر اٹھایا اور گھوڑے کی طرف چلا۔ وہیں ایک بڑا سا خوک اپنے سامنے آتے دیکھا۔ آہو تو اس نے مارے حرص کے کاندھے سے زمین پر رکھ دیا۔ اور جھٹ ایک سامنے سے اس کے کترا کر اور آنکھ اس کی بچا کر پیچھے اس کے لگ گیا۔ آخر ش قابو پا کر اُسے بھی تیر سے مارا۔ سور کے جب تیر لگا تو جھنجلا کر اپنے دانتوں سے اس کو بھی مار رکھا، اور وہ آپ بھی وہاں مر رہا۔

غرض پرمان شکاری ہرن اور خوک تینوں ایک ہی جگہ پر مر کر رہ گئے۔ گھڑی دو ایک کے پیچھے اس میدان میں ارتھ لوبھی نام ایک گیدڑ وہاں آن پہنچا۔ خوشی بہت سی کی اور خدا کا شکر بجا لایا اور کہا ایسی غذائے لطیف مجھے کبھی میسر نہیں ہوئی تھی۔ جیسی آج ہوئی، اب چند روز اچھی طرح فراغت سے کھاؤں اور کبابوں کے واسطے اچھا اچھا گوشت سکھا کر رکھوں گا۔ غرض وہ حریص یہ خیال اپنے دل میں باندھ کر پہلے کمان کے چلے کو لگا چبانے۔ کمان تو چڑھی ہوئی تھی۔ جب زہ کٹ گئی۔ تب کمان کا گوشہ ایسا زور سے سینے میں اس لالچی کے لگا کہ پانی نہ مانگا۔

جب اس حریص نے وہ شکار نہ کھایا۔ اور اُسے ذخیرہ کر رکھا اور کمان کی زہ چبانے لگا۔ یہی اس کی قسمت کا لکھا تھا۔ جو اس کے آگے آیا۔ جو کوئی زر پیدا کرے۔ لازم ہے کہ اس میں سے کچھ کھاوے، کچھ رکھے کچھ خدا کی راہ میں دیوے۔ سو تو تو نے کیا۔ مفت برباد دیا۔ اب اس کا افسوس بھی مت کر۔ چوہا بولا۔ بھائی! بات یہی ہے جو تو کہتا ہے۔ پھر باگھ نے کہا۔ اے یار! اگر مال کے واسطے کڑھے گا تو اس کڑھن سے تصدیع اٹھاوے گا۔ اور اسی کوفت میں مر جاوے گا اور لوگ ٹھٹھے مار کر یہ کہیں گے کہ کیا عقل مند تھا جس نے مال کے لیے اپنے تئیں ہلاک کیا۔ اگر جان سلامت ہے تو مال بہتیرا ہو رہے گا۔ باگھا پھر کہنے لگا۔ اے چوہے! جو گیدڑ اتنا گوشت کھاتا۔ تو اس کی نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ حاصل یہ ہے۔ جو تو نے مال نہ کھایا۔ تو غم بھی نہ کھا۔ کیوں کہ کہا ہے جب ہاتھ پاؤں کے ناخون اور دانت اور سر کے بال اپنی جگہ سے جدا (جدا) ہوئے تو محض ناچیز ہیں۔ جو زر کے واسطے غمناک رہے گا۔ تو گوشت تیرا گل جاوے گا اور ہڈیاں چونا ہو جاویں گی۔ خدا کی بندگی میں اتنا مشغول رہ کہ دنیا تیری لونڈی ہو رہے۔ دیکھا نہیں کہ جب عورت کو پیٹ رہتا ہے۔ لڑکا ہونے کے آگے خوراک اس کی حق تعالیٰ اس کی ماں کی چھاتیوں میں پیدا کرتا ہے۔ ہمارا تمہارا روزی کا دینے والا وہی داتا ہے۔ اے یار! اس مکان کو اپنا گھر جان اور تو میرے پاس رہ۔

جب اتنی فروتنی لگ پتنگ کوے نے سنی تو زبان اپنی کچھوے کی تعریف میں کھولی اور کہا اگر ہاتھی ندی کی دلدل میں پھنسے تو ہاتھی سوا کوئی اسے نکال نہیں سکتا۔ اسی طرح اس عالی خاندان چوہے پر جواب ایسا بُرا وقت پڑا ہے۔ تجھ تک آ پہنچا کہ تم بھی بڑے گھرانے سے ہو۔ بعد اس گفتگو کے چوہے، کوے اور کچھوے میں دوستی دلی ہوئی اور تینوں ایک جگہ میں رہنے لگے۔

ایک دن دیکھتے کیا ہیں، کہ چتر انگد نام ایک ہرن ان کی طرف بھاگا چلا آتا ہے بس کو دیکھ کر تینوں یار بھاگے۔ باخا ندی میں جا رہا، چوہا بل میں گھس گیا۔ اور کوا درخت پر اڑ گیا اور چاروں طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ جو ہرن کے پیچھے کوئی نہیں آتا خیر جب وہ ان کی جگہ پہنچا۔ تب کوا بولا۔ کوے کے بولتے ہی تینوں یار آ اکٹھے ہوئے مانتھر باخے نے آہو سے پوچھا۔ تیرے پیچھے تو کوئی نہیں۔ تئیں (تو) کس واسطے اتنا ہڑبڑا کر دوڑا آیا۔ خیر تو ہے؟ وہ بولا کہ میں شکاریوں کے ڈر سے ایسا گھبرا کے بھاگا آیا ہوں اور اب اپنا یہ ارادہ ہے۔ کہ اس باقی عمر کو تمہاری رفاقت میں کاٹوں۔ کچھوے نے چوہے کی طرف دیکھا۔ چوہے نے کہا، اب جو تو ڈر کر یہاں آیا ہے۔ خاطر جمع رکھ۔ اور دل میں کچھ اندیشہ نہ کر۔ تئیں ہمارا ساتھی ہوا۔ اے یارو! ہرن اور ہم آپس میں شریک نیک و بد کے ہوئے۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اور درخت کے تلے نزدیک یاروں کے بیٹھا۔ کچھوے نے اس سے پوچھا۔ یار! شکاری کون ہے اور انہیں تو نے کہاں دیکھا ہے؟ یہ بولا۔ راجہ کے بیٹے حاکم ملک کلنگ کے اپنے لشکر سمیت کنارے بھاگ رتی ندی کے آ اترے ہیں۔ میں نے یوں سنا ہے کہ وے کل اس جھیل میں مچھلیوں کا شکار کھیلیں گے۔ یہ سنتے ہی باخے کے دل میں شکاریوں کا ڈر پیدا ہوا۔ وہ کہنے لگا جو میں آج اس جھیل میں رہوں گا۔ تو کل بھوک کی آگ میں جلوں گا یعنی وے مچھلیاں پکڑ لیں گے۔ میں بھوکا مروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں کسو اور تالاب میں جا رہوں۔ کوے اور آہو نے کہا۔ بہت اچھا۔ ہرنک چوہا متامل ہو کر بولا کہ باخے کو خشکی میں چلنا مشکل ہے۔ جو تری کی راہ لے۔ تو سلامت پہنچے جیسا کہ کہا ہے۔ پانی کے رہنے والوں کو پانی کی قوت ہے اور آدمیوں کو پناہ کوٹ سے ہے یارو! جو اس کو زمین پر چلنے دو گے۔ چناں چہ بقال اپنے کیے سے پشیمان ہوا تھا۔ تم بھی اپنے کیے کی ندامت کھینچو گے۔ یاروں نے پوچھا۔ وہ قصہ بنیے کا کیوں کر تھا؟ چوہا بولا۔

نقل تنگ بیر نام ایک شخص اور نوجوبنا بقال کی بیٹی کی

شہر قنوج میں بیرسین نامی ایک راجہ تھا۔ اس نے اپنے نام کا ایک شہر بسایا۔ اور نام اس کا بیر پور رکھا۔ اس شہر کی حکومت تنگ بیر نام ایک اس کا ملازم تھا اسے دی۔ ایک مہینے کے پیچھے وہ شہر دیکھنے کو نکلا۔ ایک بقال کی بیٹی نوجوبنا نام اپنے کوٹھے پر کھڑی تھی۔ اُسے دیکھا۔ وہیں اس کی زلف ناگن نے اس کو ڈسا۔ گھوڑے سے زمین پر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ لوگوں نے پالکی میں ڈال اس کے گھر پر لا پہنچایا۔ دائی نے پوچھا۔ اے فرزند! تجھے کیا ہوا؟ کہا۔ میری نظر ایک نازنین پر پڑی ہے۔ میں نہیں جانتا۔ وہ پری تھی یا آدمی اس کے مکھ بن کا کانٹا میری آنکھوں میں چبھ گیا۔ اس درد سے میں بیقرار ہوں دائی نے معلوم کیا۔ یہ لڑکا نوجوبنا کے حسن کے تیر سے زخمی ہوا ہے۔ وہ اس فکر میں پھری کہ اس کا اور اُس کا کسی طرح ملاپ ہو۔

کسی بہانے سے نوجوبنا کے یہاں آ کر دیکھتی کیا ہے کہ اس کے جمال کی کٹاری کی ماری ہوئی یہ بھی ایسی لوٹ پوٹ ہو رہی ہے جو ہلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ آہستہ آہستہ اس

کے کان میں کہا۔ اے نوجوبنا! تیرے واسطے بیر ان کبیر روتا ہے۔ اور مدہوش پڑا ہے۔ اگر تجھ سے اس کی دست گیری ایک بوسے سے ہو سکے اور بہیت کہے۔ تو میں تجھے سونے کا ٹکڑا دوں۔ نوجوبنا بولی۔ اے نادان دائی! یہ سودا اور دکان سے جا کر خرید کر۔ دائی نے پھر عذر کیا کہ پھول میرا! تیری محبت کے آفتاب سے مرجھایا ہے۔ جو تیرے ہی جمال کا سایہ پڑے تو تر و تازہ ہووے۔ نوجوبنا بولی۔ اے دائی! اس میرے باغ کا نگہبان میرا خاوند ہے۔ یہ اس کے منہ کی بات سن کر دائی چپکے سے پھر آئی۔ تب تن کبیر دیکھ کر کہنے لگا۔ اے دائی! کچھ ذری حلوا کو؟ یعنی محنت کی مزدوری کہاں؟ دائی نے کہا، میں اپنے کام کو پختہ کر آئی ہوں۔ لیکن چند روز صبر کیا چاہیئے۔ وہ اپنے شوہر سے ڈرتی ہے۔ اس کا میں ایک علاج کرتی ہوں۔ جو اس کا خاوند خود تمہارے پاس لا پہنچاوے۔ سن لڑکے! کام حکمت اور عقل سے نکلتا ہے۔ اور زبردستی سے ہرگز نہیں بن پڑتا ہے۔ کیا تو نے قصہ گیدڑوں کا نہیں سنا کہ عقل کے زور سے جیتے ہی ہاتھی کو کھا گئے؟

تن کبیر نے کہا۔ وہ قصہ کیوں کر ہے؟ دائی بولی۔

نقل دھول تمک ہاتھی اور آتما نام گیدڑ کی

یوں کہتے ہیں کہ ڈنڈ کلان نام ایک جنگل ہے۔ اس میں دھول تمک نام ایک مست ہاتھی تھا۔ گیدڑ اس کی فکر میں ہوئے کہ کسی طرح دو تین مہینے تک اس کا گوشت کھاویں۔ ان میں ایک آتما نام گیدڑ تھا۔ اس نے کہا۔ یارو! اس ہاتھی کو میں دانائی کی زنجیر سے باندھ کر حکمت کے تیروں سے ماروں گا۔ یہ کہہ کر جلد چلا۔ جب ہاتھی کے پاس پہنچا، سلام کر کے ادب سے بتفاوت کھڑا ہوا۔ اس نے پوچھا تو کون ہے؟ کہاں سے آیا؟ بولا۔ مجھے سب جانوروں نے اور گیدڑوں کے راجاؤں نے تمہاری خدمت میں بھیجا ہے۔ اور یہ پیغام دیا ہے۔ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اس جنگل کا بادشاہ کریں، اگر قبول ہو تو آپ اس میں ایک دم توقف نہ کیجیے۔ جلد چلیے۔ دونوں بادشاہ سارے جانوروں سمیت تمہارے منتظر ہیں۔

ہاتھی مارے خوشی کے جلد جلد چلا۔ گیدڑ قریبی جھیل کی راہ سے (جس میں چور بالو تھی) لے چلا۔ وہ تو ہلکا تھا، دبے پاؤں جھیل کے پار جا کھڑا ہوا۔ اور اس کو بلانے لگا۔ کہ ناک کی سیدھ چلے آؤ۔ پانی بہت تھوڑا ہے۔ ہاتھی بوجھل تھا۔ پاؤں رکھتے ہی دلدل میں پھنس گیا۔ کہا، یار۔ کیا کیا چاہیئے؟ گیدڑ بولا کہ میری دم پکڑ لے تو میں تجھے ندی سے نکال لوں۔ اس نے کہا اے نادان تیرے زور سے میں کیونکر نکلوں گا۔ تب گیدڑ بولا۔ اگر تم کہو تو میں اپنی قوم کو بلاؤں جو تمہیں اس دلدل سے کھینچ نکالے؟

ہاتھی اس چہلے میں پھنسنے سے ایسا عاجز ہو کے ہاتھ پاؤں مارتا تھا کہ جیسے کوئی دریا میں بہتے ہوئے تنکا دیکھ کر ہاتھ بڑھاوے کہ شاید اس کے آسرے سے بچ جاؤں۔ پھر اس کو وہ تنکا ناچیز کیا فائدہ کرے۔ مارے بدحواسی کے کہنے لگا کہ اچھا تو جا اپنے یاروں کو بلا کر دے مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دیں۔ گیدڑ دوڑا اور اپنی تمام بلادری کو بلا لایا اور آپ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور وے پیچھے سے ہاتھی کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھانے لگے۔ تب ہاتھی نے کہا۔

داغ دل میں تو نے میرے تخم الفت بو دیا
آخرش تو نے کیا وہی تیرے دل میں جو تھا
دل میرا اے کر ہوا افسوس ظالم سنگدل
تھا ترے دل میں یہ کب میں جانتا تھا دل جلا

پھر دائی نے کہا۔ اے تن کبیر! تو نے دیکھا کہ اپنی عقل کے زور سے گیدڑ نے ہاتھی کا کام تمام کیا۔ کیا مجھ سے اتنا بھی نہ ہو گا کہ میں اپنی عقل کی رسائی سے تیرا کام بخوبی انجام دوں۔ وہ کون سا کام ہے جو عقل سے نہیں ہو سکتا۔ تن کبیر نے کہا۔ اے دائی! میرے دل کا شاہین نوجوبنا کے مرغ حسن کے درپے ہے۔ اس عیب سے نہ چہرے پر رنگ ہے، نہ دل میں قرار۔ آخرش دائی تن کبیر کے کان میں کچھ ایسی باتیں کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ کہ جس سے طالب اپنے مطلب کو پہنچے۔ تب تن کبیر نے نوجوبنا کے خاوند کو بلا کر نوکر رکھا اور بہت سا سرفراز کیا اور اچھے اچھے کام اس کو سونپے۔ ایک دن تن کبیر نے اس سے کہا کہ اے یار! میں نے آج رات کو ایک خواب دیکھا ہے کہ ایک عورت شیر پر سوار ہے، اور مجھ سے کہتی ہے کہ اگر تو ایک مہینے تک ہر روز ایک عورت کو اپنے گھر بلوا دے، اور تاش بادلا پہناوے اور پٹکا اپنے گلے میں ڈال کر اس کے پاؤں پڑے اور رخصت کر دیا کرے تو تیری عمر و دولت دن بدن بڑھے گی اور جو عورت تیرے پاس سے زری پوش ہو کر جاوے گی۔ اس کے بیٹا بے شبہ پیدا ہووے۔ اور اس کے خاوند کی عمر دراز۔ اگر یہ کام تجھ سے نہ ہو سکے گا تو شوہر نوجوبنا کا (جو تیرے پاس رہتا ہے) مر جائے گا۔ اور اس کے بعد تو بھی نہ بچے گا۔ بھلا کہہ تو اب کیا کیا چاہیئے؟ اس بقال نے کہا جو کچھ حکم ہو موافق اس کے کروں۔

تن کبیر نے کہا کہ عورت لانا تمہارا کام ہے اور تاش بادلا پہنانا میرا ذمہ۔ جب رات ہوئی۔ بقال نے ایک رنڈی اس کے یہاں لا پہنچائی۔ اُسے وہ اپنی خلوت میں لے گیا۔ تب بنیا چھپ کر دیکھنے لگا۔ کہ دیکھوں تو اس عورت پر وہ ہاتھ ڈالتا ہے کہ نہیں، دیکھا کہ اس نے ایک جوڑا زری کا پہنا کر پٹکا اپنے گلے میں ڈال اس کے پاؤں پڑ رخصت کیا۔ بقال نے یہ سب احوال دیکھ کر اپنے دل میں کہا، کہ تن کبیر عجب بے وقوف ہے جو اتنا لباس زربفت کا اسے مفت دیا۔ جب بقال اور وہ عورت دونوں باہر آئے اس نے عورت کو کہا کہ آدھے کپڑے اس میں سے مجھے دے۔ وہ بولی۔ مجھے تو تن کبیر نے دیئے ہیں۔ تجھے کیوں دوں؟ غرض وے دونوں آپس میں یہاں تک جھگڑے کہ کپڑے عورت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور آدھی داڑھی بقال کی اس عورت نے کھسوٹ لی۔ تن کبیر کو جو یہ خبر پہنچی تو بہت سا ہنسا اور جانا کہ آج کل مطلب میرا حاصل ہو گا۔

بقال نے اپنی جورو سے سب احوال مفصل رات کا کہا۔ اس نے جواب دیا کہ تو کسی ادنیٰ کم ظرف کو لے گیا ہو گا۔ اگر کسی معتبر کو لے جاتا تو ایسا فضیحت نہ ہوتا۔ دوسری رات ایک عمدہ رنڈی کو لے کر گیا۔ تن کبیر نے ویسا ہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جیسا کہ پہل کے ساتھ کیا تھا۔

بقال یہ دیکھ کر اپنے دل میں حسرت کرنے لگا۔ تیسرے دن اپنی عورت سے کہا اے نوجوبنا! اتنی دولت بے فائدہ جاتی ہے۔ اگر ایک رات تو میرے ساتھ چلے تو سب دولت تیرے ہاتھ آوے۔ وہ بولی کہ میں نامحرم مرد کے گھر کیونکر جاؤں۔ بقال کو اپنی عورت پر نہایت اعتماد ہوا، اور کہنے لگا کہ تن کبیر پہنچتے ہی لباس زری کا دیتا ہے، اور پاؤں پڑ کے رخصت کرتا ہے۔ نوجوبنا نے کہا جو عورت اپنے خاوند کے حکم میں نہ ہو قیامت کے دن اس کو عذاب میں گرفتار کریں گے۔ میں تیری رضامندی چاہتی ہوں، جو کچھ کہے گا بسر و چشم قبول کروں گی۔ بقال نہایت خوش ہوا اور کہنے

لگا رحمت خدا کی تیرے ماں باپ پر۔

جب آفتاب سیارح آسمان کے میدان کو طے کر کے مغرب کے گوشے میں پہنچا۔ تخمیناً پہر رات گئی ہوگی جو بنیا کم عقل بر دستورِ سابق اپنی جورو کو بھی دولت کی طمع سے تن کبیر کے پاس لے گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی باغ باغ ہو کر اپنے خلوت خانے میں لیا اور کہنے لگا۔۔ اے نوجوان بنیا! تیرے کافرِ عشق کے لشکر نے میرے ملکِ دل کو خراب کیا تھا۔ تیرے آنے سے بارے آباد ہوا۔ بنیا جو وہاں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ اس بات کے سنتے ہی شرمندہ ہوا۔ اپنا سر پیٹتے گھر کی راہ لی۔

اے یارو! اگر کچھوا خشکی کی راہ چلے گا تو جیسا بقال اپنے کیے سے پشیمان ہوا تھا۔ یہ بھی ہوگا۔ کچھوے کا دل ہرن کے خبر دینے سے شکاریوں کے ڈر کے مارے تو گھبرا ہی رہا تھا۔ چوہے کے کہنے پر عمل نہ کیا۔ ہرن اور کوے کی صلاح سے ماتالاب کو چھوڑ چل نکلا کوے چوہے اور ہرن کو بھی اس کے ساتھ جانا ضرور پڑا۔ کچھوے کے پیچھے لگ چلے۔ بہزار خرابی کوس بھر گئے۔ ہوں گے، چاہا کہ کسی درخت کی چھاؤں میں ٹھیریں۔ یکایک دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مرد شکاری تیر کمان لیے چلا آتا ہے۔ ہر ایک یار نے اپنی اپنی راہ پکڑی کوا تو درخت پر جا بیٹھا، اور چوہا کسی بل میں گھس گیا۔ اور ہرن جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

کچھوا تری کا جانور تھا۔ خشکی میں بھاگ نہ سکا۔ وہیں رہ گیا۔ تب شکاری نے اسے پکڑ کر چاروں ہاتھ پاؤں باندھ کر کمان کے گوشے میں لٹکا اپنے گھر کی راہ لی۔ جب تینوں یاروں نے دیکھا کہ کچھوا پکڑا گیا۔ تو سب رونے لگے۔ چوہا بولا۔ اے بھائیو! میں تم سے نہ کہتا تھا کہ کچھوا اگر خشکی سے جائے گا تو نہایت رنج اٹھائے گا۔ اب ہماری آہ و زاری کچھ کام نہیں کرتی۔ اب ایسی تدبیر کرو جس سے کچھوے کی خلاصی ہو [illegible] کوے اور ہرن نے کہا۔ اے صاحبِ حکمت بے نظیر تری عقل و تدبیر کیا ہے اس کو جلد بتلا معلوم [illegible] چوہا بولا۔ اے ہرن یہاں سے آگے جا کر جہاں کہیں پانی کا ڈبرا نظر آوے تو لنگڑا کر کھڑا ہو جیو۔ جب وہ تیر انداز شکاری آوے تو آہستے آہستے لنگڑاتے ہوئے بھاگیو۔ ہرن نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ مرد کچھوے سمیت پانی کے کنارے پہنچا۔ دیکھا کہ ہرن لنگڑاتا کھڑا تھا۔ کچھوے کا لالچ نہ رہا تھا۔ اس کو زمین پر رکھ دیا اور ہرن کے پیچھے لپکا۔ جب قریب تیر کے فاصلے پر گیا۔ چوہے نے پیچھے سے کچھوے کی پھانسی کاٹ کر ہرن کو پکارا۔ اور کہا۔ اے ہرن! کچھوا صحیح سلامت پانی میں آ پہنچا۔ تو بھی جنگل کو بھاگ جا۔ وہ یہ بات سنتے ہی بھاگا۔ جس وقت تیر انداز ہرن کے پیچھے سے پھر آیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ کچھوا نہیں۔ پشیمان ہو کر بولا کہ [illegible] کہہ گئے ہیں کہ جو کوئی آدھی کو چھوڑ ساری کو دوڑے تو آدھی بھی ہاتھ نہ آوے۔ اگر میں ہرن کے پیچھے نہ جاتا تو کچھوا میرے ہاتھ سے نہ جاتا۔ شکاری افسوس کرتا چلا گیا۔ تب ان چاروں یاروں نے اکٹھے ہو کر خوشی کی اور کہا کہ [illegible] ایسی جگہ ہم رہیں گے۔ چوہا [illegible] کچھوا چاروں [illegible] جگہ [illegible] کر رہنے لگے۔

جب برہمن نے یہ قصہ دوستی کی تمام کیا [illegible] کو کمال خوشی ہوئی۔ اور کہنے لگے کہ محبت اور دوستی کی [illegible]

[illegible]

داستان بھاگ بھرتا بنیے اور سنجوگ اور نندک بیل کی

پنڈت بولا کہ چندرپور نام ایک شہر تھا۔ اس میں ایک مال دار بنیا بھاگ بھرتا نام رہتا تھا۔ جب کسی بڑے دولت مند کو دیکھتا تو اپنے تئیں فقیر جان کر دل میں یہ بات ٹھہراتا۔ کہ تجارت کو جایا چاہیے۔ تاکہ مال زیادہ ہووے جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ مجہول آدمی کے ہاتھ دولت نہیں لگتی اور دنیا ایسی جگہ ہے کہ اگر مال کمینے اور کم ذات کے پاس ہووے تو سب لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔

یہ سوچ کر دو بیل خرید لایا۔ ایک کا نام سنجوگ اور دوسرے کا نندک رکھا۔ موتی، لعل، ہیرا، پنا اور کچھ زری بافی خرجیوں میں بھر بیلوں پر لاد کر کشمیر کی راہ لی۔ تخمیناً بیس اکیس منزل گیا ہوگا کہ سنجوگ کا ایک کھڈے میں پاؤں پڑتے ہی ایسی ضرب آئی کہ چلنے سے باز رہا۔ تب بنیا متفکر ہو کر کہنے لگا کہ یہ عبث کا دیوانہ پن ہے جو کوئی مال کے جمع کرنے کے واسطے کہیں جاوے۔ کیونکہ جو کچھ خدا نے قسمت میں لکھا ہے۔ جہاں رہے مل رہتا ہے پھر یہ فکر کرنے لگا کہ اس اسباب کو کس طرح لے جاؤں اسی تردد میں دو تین روز اسی جنگل میں رہا۔

اتفاقاً ایک قافلہ سوداگروں کا مال بیچ کر بیلوں کو خالی لیے ہوئے وہاں آنکلا بنیا ان تاجروں کو دیکھ کر ان کے پاؤں پڑنے لگا، اور اپنا احوال کہنے لگا سوداگروں نے اس کی بے کسی پر رحم کھا کر ایک بیل حوالے کیا۔ اس نے اس لنگڑے بیل کو وہیں چھوڑا اور جو بیل قافلے سے لیا تھا۔ اس پر خرجی لاد کر اپنی منزل مقصود کی راہ لی اور سنجوگ دو تین مہینے تک نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ ایسی گھاس اس جنگل کی کہ کسی جانور نے آنکھوں نہ دیکھی ہوگی۔ چر چگ کر سانڈ بن گیا۔

حکایت سنجوگ اور پنگل نام شیر کی

ایک دن ندی کے کنارے وہ چرتا تھا کہ پنگل نام ایک شیر جو اس جنگل کی بادشاہت کرتا تھا۔ پانی پینے کے لیے آنکلا۔ بیل اس شیر کو دیکھ کر مارے مستی کے کھود کرنے اور سینگوں سے زمین کھودنے لگا اور جیسا دل لگ جاتا ہے ویسا ہی ڈکارنے لگا۔ شیر نے جو اسے اس طرح دیکھا تو اس کے ڈر کے مارے بھاگ کر اپنی جگہ جا بیٹھا اور جی میں کہنے لگا کہ آج خدا نے میری جان بچائی۔ کئی برس سے میں اس جنگل کی بادشاہت کرتا ہوں لیکن ایسی بلا اور ایسا عجیب جانور میں نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

حکایت دو گیدڑ دمنک و کرتک کی

ایک شہر میں تھا کہ دو گیدڑ دمنک اور کرتک نام جو شیر کے وزیر تھے اور اس نے ان کی کچھ تقصیر پا کر نکلوا دیا تھا۔ آس پاس اس کے لگے رہتے تھے۔ شیر کے پانی نہ پینے کی کیفیت اور اس کی سراسیمگی کا معلوم کر کے آپس میں کہنے لگے کہ آج کیا سبب ہے۔ جو شیر نے پانی نہ پیا۔ پیاسا ہی الٹا چلا آیا اور نہایت غمگین ہو رہا ہے [illegible] اور سبب پریشانی کا پوچھیے کہ آپ متفکر کیوں ہیں۔ کہا اس میں وہ کچھ برا نہ ہوگا۔ [illegible] ہے کہ [illegible] بھائی! اس نے ایک مدت ہوئی کہ ہم کو اپنی خدمت سے معزول کیا ہے۔ ہمیں کیا غرض جو اس کے پاس جاویں۔ وہ جانے اور اس کا کام۔ جس روز سے کہ ہم اس سے جدا ہوئے ہیں خدا ہم کو بے خلل و غش روزی پہنچاتا ہے۔ اس کا شکر بجا لاتے ہیں [illegible] جو خوب دیکھا تو بندگی خالق ہی کی خوب ہے اور [illegible] کی اطاعت کرنی اچھی نہیں۔ اس واسطے بادشاہ کی نوکری کرنے کو ہمارا جی نہیں چاہتا۔ اور جو شخص کتوں کی خاطر بھوکا رہ کر [illegible] تو اس کی کمائی حماقت ہے۔ کیوں کہ خسرو دل ہمارا جسم کے ملک میں آ [illegible]

کرتا ہو۔ اس کو کیا ضرور ہے کہ غیر کا فرماں بردار ہو۔ اگر کسی نوع کی کچھ احتیاج رکھتا ہو۔ تو مضائقہ نہیں۔ اے یار! نوکری میں کچھ اختیار اپنا باقی نہیں رہتا۔ چناں چہ جاڑا، گرمی، برسات، بھوک پیاس، زمین پر سونا، جنگل جنگل پھرنا۔ یہ سب اُسے پہ اُٹھانا ضرور پڑتا ہے۔ اگر ایسی محنت خدا کی بندگی میں کوئی کھینچے تو فرشتے سے بھی فوقیت لے جاوے۔ اور دوسرے کی تابع داری میں جیا مرنے سے بدتر ہے کیوں کہ جب کوئی کسی کا نوکر ہے۔ اور وہ کہے کہ تو فلانے مکان کو جا۔ گو کہ ہر ایک منزل اس کی دشوار پر خطر ہو اور وہاں جاتے ہی مارا جائے۔ تو بھی خواہ مخواہ جانا ہی پڑے۔

دمنک نے کہا۔ اے بھائی! جب تک کہ کوئی کسی کی خدمت نہیں کرتا۔ تب تک بڑے مرتبے کو نہیں پہنچتا اور ہاتھی گھوڑے دولت دنیا نہیں پاتا۔ صاحب جاہ و حشم نہیں ہوتا۔ ہم نے ایک مدت تک اس کا نمک کھایا ہے۔ ضرور ہے کہ ہم اس کے پاس جاویں اور اس کا احوال پوچھیں۔ کرتک نے کہا کہ میں یہ صلاح نہیں دیتا کہ تو شیر کے پاس بے بلائے جاوے۔ اور اس کے بے پوچھے کچھ بات کہے۔ کیوں کہ اب اس کام کا عہدہ کہ جس پر ہم تھے۔ اوروں کے ہاتھ میں ہے۔ جو کوئی ہاتھ ڈالے۔ تو اس کی وہ حالت ہو جیسی بندر کی ہوئی۔ دمنک بولا۔ کہ اس کا قصہ کیوں کر ہے؟۔ کرتک نے کہا۔

نقل ایک بڑھئی اور بندر کی

یوں کہتے ہیں کہ کسی ولایت میں مدن دھرم نام ایک جنگل ہے۔ اس میں ایک بڑھئی لٹھا آرے سے چیرتا تھا۔ جب آرا اٹکنے لگتا تو وہ دو لکڑی پکڑ اکھیڑ کر نزدیک لا لگاتا۔ بڑھئی کی یہ حرکات کسی درخت پر بیٹھا ہوا بندر دیکھتا تھا جو اتنے میں بڑھئی کو پیاس لگی۔ پانی پینے کو کسی تالاب پر گیا۔ بندر درخت سے اُتر کر اس لکڑی پر آ بیٹھا اور جس طرح بڑھئی کو پچر اکھیڑتے دیکھا تھا۔ یہ بھی اکھیڑنے لگا۔ پچر اکھڑی وہیں اس کے فوطے لٹکنے کی درز میں پھنس کر پس گئے اور فی الفور وہ مر گیا، کیوں کہ بندر کا کام نجاری نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جس کا کام اس کو چھاجے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ جو غیر کے کام میں دخیل ہوگا تو ایسا ہی بُرا دن اس کے آگے آوے گا۔ پھر کہا۔ اے یار! ان دنوں میں شیر کے پاس بہت سے مصاحب ہیں، تیرے جانے سے وہ کب خوش ہوں گے۔ بلکہ تیری فکر میں رہیں گے۔ دمنک نے کہا۔ بھائی! شیر ہمارا قدیم خاوند (خداوند) تھا اور ہم اس کے خدمت گاروں میں تھے۔ پس ہم کو اور تم کو لازم ہے کہ اس کے پاس ایسے وقت میں جاویں اور جو کچھ ہم سے ہو سکے۔ اس میں قصور نہ کریں تب کرتک بولا۔ اے یار! جو کوئی اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کے کام میں دخیل ہو۔ تو ایسا ہی وہ انعام پاوے جیسا شام بھگت گدھے نے اپنے خاوند سے پایا۔ دمنک بولا وہ کیوں کر ہے؟ کرتک نے کہا۔

نقل شام بھگت گدھے اور کنجو دھوبی کی

یوں سنتے ہیں کہ گنگا کے کنارے بنارس نامی کوئی شہر ہے وہاں ایک نوجوان دھوبی کنجو نام بڑا دولت مند رہتا تھا۔ ایک شب وہ اپنی جورو کے ساتھ غافل سوتا تھا کہ اس کے گھر میں چور آئے۔ شام بھگت گدھا آنگن میں بندھا تھا، اور اس کی بغل میں کپوت نامی کتا بیٹھا ہوا تھا۔ گدھے نے کہا۔ اے کتے! گھر میں خاوند کے چور آئے ہیں تو ذرہ بھونک۔ جو گھر کا مالک جاگے۔ کتا بولا۔ اے گدھے میرے کام میں دخل مت کر تو کیا جانے اس دھوبی کے گھر میں میری قدر کچھ نہیں۔ جب تک کہ اس کا نقصان نہ ہوگا۔ تب تک میری قدر نہ جانے گا۔ گدھے نے کہا۔ اے کتے! جو کوئی اپنے صاحب کی بندگی میں قصور کرے۔ تو وہ ملعون خلائق ہوتا ہے۔ کتا بولا ۔ او گدھے! اگر تو میرے عہدے میں ہاتھ ڈالے گا۔ تو تجھ پر میرا صبر پڑے گا۔

اس نے اس کی بات نہ مانی اور جلدی سے اپنے ہاتھ پاؤں کے چھاندا توڑ تا جہاں دھوبی اپنی جورو کے ساتھ سوتا تھا۔ وہاں جا کر رینکنے لگا۔ وہ جو کچی نیند سے چونکا۔ تو مارے غصے کے ایک سونٹا لے کر اُسے خوب مار پیٹ ڈالا جو گدھے کی بات نہ مانی تو اس کے صبر میں گرفتار ہوا۔

دمنک بولا۔ اے کرتک! یہ سچ ہے جو کوئی دوسرے کے کام میں دخل کرے۔ تو اس کی یہی سزا ہے۔ لیکن تو جانتا ہے کہ جب ہم شیر کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ جو کچھ اس کا جھوٹا پاتے تھے، کھاتے تھے۔ اور بڑوں کے پاس رہنے سے کئی کام نکلتے ہیں۔ پہلے دوستوں کا بھلا ہوتا ہے، پھر دشمنوں کا بُرا۔ اور جو اس کے ماتحت رہتے ہیں ان کی پرورش بخوبی تمام ہوتی ہے۔ کرتک نے کہا۔ اے دمنک! برسوں سے یہ شیر ہم سے آزردہ ہے اور اس نے در دولت سے نکال دیا ہے۔ مجھے تجھے اس سے اب علاقہ نہیں۔ اگر بے بلاوے اُس کے تو جاوے گا۔ اور بے پوچھے کچھ کہے گا۔ تو وہ کب تیری سنے گا۔ مثل مشہور ہے: "التفات شحنہ مردک نام" اس نے کہا کہ تو نہیں جانتا خاوند[1] کبھی خفا ہوتے ہیں اور کبھی مہربانی کرتے ہیں۔ اس بات کو اپنے جی میں لا کر نہایت بچو

سنو بھائی! نیکی حاصل کرنی بے رنج و محنت ممکن نہیں، جیسا کہ ایک بھاری پتھر نیچے سے اونچے پر لے جانا، اور بدی ایسی ہے کہ اسی پتھر کو نیچے گرا دینا۔ اگرچہ شیر ہم سے آزردہ ہے لیکن اب وہ حادثے میں گرفتار ہے۔ اگر اس وقت ہم نہ جاویں تو اس کو کوئی بُرا نہ کہے گا۔ بلکہ ہم کو لوگ حرام خور کہیں گے۔ تھوڑے کے واسطے بدنامی اٹھانا خوب نہیں۔ اگر تو کہے تو شیر کے پاس جاؤں؟

کرتک بولا: "میں نے تیری بات مانی لیکن بادشاہ کے حضور میں جا کر پہلے کیا کہے گا؟" دمنک نے کہا: "یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ کس سے ڈرا ہے، اس لیے غم گیں ہو کر بیٹھا ہے جو احوال ہو سو اس سے پوچھ لیجیے اور خلش اس کی دل سے مٹا دیجیے" کرتک نے کہا: "یہ اس پر کیوں کر کھلے کہ تو اس پر مطلع ہوا ہے اور تو نے کیوں کر جانا کہ اس کے جی میں دہشت بیٹھی ہے؟" دمنک نے کہا: "ڈرا ہوا قرینے سے پہچانا جاتا ہے، اور وہ عاقل نہیں ہے جو پوچھ کر معلوم کرے" تب کرتک نے کہا: "بھلا آدمی اسے کہتے ہیں جو نیکی کرے لیکن منہ پہ نہ لاوے اور خاوند کو خوش رکھے اگر وہ کتنا ہی منہ لگا دے پر اپنی حد سے قدم آگے نہ بڑھاوے اور اپنے تئیں نت نیا نوکر جانتا رہے اور اس کے حکم کو مانتا رہے۔"

پھر دمنک نے کہا کہ مجھے مناسب نہیں ہے جو میں گیدڑوں میں بیٹھ رہوں، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اپنی خدمت کی قوت سے شیر کو اپنا کروں۔ کہتے ہیں خاوند کی مرضی کے تابع رہنا اور اپنی قدر کے موافق بات کرنا ہر ایک سے نہیں ہو سکتا، اور سب ہنروں سے میں واقف ہوں۔ کرتک نے کہا۔ "بھائی! خدمت کرنی بہت مشکل ہے۔ جیسی چاہیے ویسی کسو سے ادا نہیں ہو سکتی۔" دمنک بولا کہ نوکر پہلے اتنا دریافت کرے کہ جب خاوند کے سامنے جاوے، وہ اُسے دیکھ کر خوش ہو کے

---

[1] مالک، آقا۔

کچھ بات کہے اور بیٹھنے کی پروانگی دے، تب معلوم کیجئے کہ مجھ پر مہربان ہوا۔ اگر اس کے دیکھنے سے وہ تیوری چڑھا کر منہ پھرا دے تو برعکس سمجھے اور یقین جانے کہ اس کے دل میں میری طرف سے کچھ کدورت ہے۔ اس خاوند سے کچھ نہ بولے اور ٹل جاوے۔

کرٹک نے کہا ”اگر بادشاہ تجھ کو کتنا ہی سرفراز کرے، چاہیے کہ بے پوچھے اور بے محل دم نہ مارے“۔ دمنک نے کہا ”تو اپنے دل میں کچھ فکر مت کر کہ میں اپنے نقد سخن کو بے جا خرچ نہ کروں گا مگر دو جگہ: ایک تو جس وقت دشمن ایسی گھات میں ہو کہ آج کل میں دغا سے کام کو ابتر کرے اور دوسرے ایسے کام میں کہ جس سے نقصان خاوند کا ہوتا ہو اور تو اسے دیکھنا کہ میں بغیر خیر خواہی کے ایک بات بھی بادشاہ سے ہرگز نہ کہوں گا۔ خدا چاہے تو تھوڑے دنوں میں اپنے ذہن کی رسائی سے وزیر کہلاؤں گا۔ اب مجھ پر مہربانی کیجئے اور خوشی سے رخصت دیجئے۔ پھر ایسا قابو نہ پاؤں گا، ہاتھ مل کر رہ جاؤں گا؟“

کرٹک بولا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو جانے بغیر نہ رہے گا۔ اب میں نے تجھے خوشی رخصت کیا اور خدائے کریم کو سونپا۔ تب دمنک یہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس گیا اور آداب بجا لایا۔ شاہ نے اس پر بہت سی مہربانی اور شفقت کر کے بیٹھنے کا حکم کیا اور کہا ”اے دمنک! ہم نے بہت دن پیچھے تجھ کو دیکھا۔ اتنے دنوں تو ہمارے پاس کیوں نہ آیا؟“ بولا ”اپنی کم نصیبی ہے۔ لیکن اب میرے طالعوں نے جو پھر یاوری کی تو میں حضور میں حاضر ہوا اور جہاں پناہ کی خدمت میں مشرف۔“ حضرت نے فرمایا ”خیر آئندہ ایسا نہ ہو۔“ تب وہ مودب ہو کر کہنے لگا کہ غلام کا کیا مقدور کہ خاوند کی خدمت سے ایک دم غیر حاضر رہے۔ شیر نے کہا ”اے دمنک! تو تو ہمارا قدیم رفیق ہے، سچ کہہ اتنے دنوں نہ آنے کا تیرے کیا سبب؟“ اس نے عرض کی:

میں ہوں کس لائق جو تیری دوستی کا دم بھروں
ہاں مگر دانا ترے کوچے کے میں کتوں میں ہوں

غلام اس واسطے حاضر نہ ہوا کہ مجھ بغیر جہاں پناہ کا کام کسی طرح سے بند نہیں۔“ شیر نے کہا ”اے نادان! مرد کو چاہیے کہ اپنے قدیم خاوند کی تنگ حالی میں قصور نہ کرے اور کبھی کبھی اس کے یہاں حاضر ہوا کرے، اور جس کو خدا نے ہاتھ پاؤں اور دانائی، بینائی اور ہوش گوش دیا ہے، وہ کیوں کر کسی کے کام آوے۔ سنتا ہے اتنے دنوں جو تو ہم سے جدا رہا تو اس میں سراسر تیرا ہی نقصان ہوا۔ اب جو تو ہمارے حضور اعلیٰ میں حاضر ہوا ہے، تھوڑے دنوں میں اتنی دولت تیرے ہاتھ لگے گی کہ مستغنی ہو جاوے گا۔“

بادشاہ کو جو اس نے اپنے اوپر مہربان دیکھا تو عرض کی ”خداوندا! اگرچہ بگلا درخت کے اوپر رہتا ہے اور قاز نیچے، لیکن وہ اوپر کے بیٹھنے سے افضل نہیں ہو سکتا۔ جہاں پناہ نے جو اوروں کو وزارت کا عہدہ سپرد کیا ہے، کیا وے مجھ سے نظر ہو، ہمیشہ ہنرمندوں کی جستجو میں رہے کیوں کہ عقل مند بہت کم یاب ہوں اور نادانوں کی بیچ گنی ہیں۔ خداوندا! اگرچہ حضور میں ہرن، پاڑھے، چکارے بہت سے جمع ہیں لیکن بے وقوفوں سے بھلائی کی کیا توقع۔ یہ اسی کام کے ہیں کہ سر پر سینگ لیے پھریں اور ایسے کام جو دشمن نہ کرے سو کریں۔

دشمن جاں ہووے اگر ہوشیار
اس سے ہے بہتر جو ہو نادان یار

جہاں پناہ! یہ جو اور امرا حضور میں حاضر ہیں، مجھے بہ نظر حقارت دیکھیں گے اور جناب عالی کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اس بے وقوف کم اصل گیدڑ کو سردار نہ کیا چاہیے اور جو کوئی ان امرا کل میں سے لائق ہو اس پر مہربانی کر کے سرفراز کیجئے۔ جو ہر وقت خدمت میں حاضر رہے۔“

یہ کہہ کر کہنے لگا ”پیر و مرشد! خاوندوں کو یہ لازم نہیں ہے جو ہر ایک کو منہ لگاویں اور ہر کدام کی بات نہیں بلکہ یوں چاہیے جو جس لائق ہو اس کی اتنی ہی قدر کریں۔ اور ہمیشہ احوال پرسان رہیں۔ اگر خاوند عقل مند اور قابل رفیق کو ذلیل کر کے احمق کو عزیز رکھے اور کسی مشکل کام کرنے کے واسطے اس کو حکم کرے تو ایسا ہے جیسے کوئی سر کی پگڑی پاؤں پر پہنے اور پاؤں کی جوتی سر چڑھاوے۔ لوگ جوتی اور پگڑی پر نہیں ہنستے بلکہ اسی پر ٹھٹھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص دیوانہ ہوا۔

پس بادشاہ کو چاہیے کہ عاقل اور ہنرمندوں کو دوست اور معزز رکھے تاکہ اچھے اچھے لوگ اس کے یہاں جمع ہوں اور جو بادشاہ اپنے یہاں سے اہل علم ہنر کو خارج کرے تو یقین ہے کہ بادشاہت اس کی قائم نہ رہے، کیوں کہ داناؤں کو نکال دینے سے فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور رعیت و پرجا خود بہ خود بھاگ جاتے ہیں۔ ملک اجاڑ ہو جاتا ہے، سلطنت اس کے قبضے میں نہیں رہتی ہے۔ یہ یاد رکھو کہ ملک کی آبادی عدل و انصاف سے ہے، اگر انصاف نہ ہو تو ملک ویران ہو جاوے۔ اور جب تک وزیر دانش مند اور بادشاہ نیک نیت نہ ہو تب تک ملک میں خلل ہی پیدا ہوتا ہے۔

اے خداوند! اگر اچھی بات دانائی سے لڑکا کہے تو اس کو بھی پلے باندھیے اور بوڑھا جو بری بات نادانی سے کہے، ہرگز اس پر کان نہ دھرے۔ جس میں عقل اور علم اور تحمل ہو، کیا چھوٹا، کیا بڑا، کیا بوڑھا، کیا بالا، وہی سب سے بہتر ہے۔

پنگل نے کہا ”اے دمنک! اگرچہ تو کئی مہینے دشمنوں کے ڈر سے میرے پاس نہ آیا، کچھ مضائقہ نہیں۔ تو بڑا نمک حلال ہے، اس لیے میں نے تجھے اپنا وزیر کیا۔“ دمنک نے عرض کی ”آپ کے اقبال سے ڈر تو کسو سے نہ تھا، مگر پیادہ پائی کے سبب سے حاضر نہ ہو سکا۔“ شیر بولا ”کیا گھوڑا چاہتا ہے؟“

اس نے التماس کیا کہ خداوندا! اسی اندیشے سے آپ نے مجھ کو حضور سے دور کیا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا ”یہ چالاکی تو نے کس سے سیکھی؟“ پھر بولا ”اب تیرے افلاس کے دن گئے اور فراغت کے آئے۔ سچ ہے کہ تجھ سا عقل مند میرے نوکروں میں کوئی نہیں۔ اب میں تجھ پر مہربان ہوں، جو تیرا مطلب ہو بلا وسواس حضور میں ظاہر کر۔“ وہ بولا کہ غلام کی عرض یہ ہے جو اس روز ندی پر پانی پینے گئے تھے، بے پیئے پھر آئے، اس کا کیا سبب؟ اس نے کہا ”تو بڑا دانا اور نہایت عقلمند ہے، اس میں ایک بات تنہائی کے کہنے کی ہے، کیونکہ اگر اسے ہمارے مصاحب سنیں تو بھاگ جاویں۔“ یہ کہہ کر اسے خلوت میں لے جا کر کہنے لگا کہ اس جنگل میں ایک ایسا جانور آ کر رہا ہے جس کی مہیب آواز نے میرے دل کو اس قدر بے چین کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ اس اندیشے سے میں اپنا گھر چھوڑا چاہتا ہوں، بلکہ تو نے بھی اس کی آواز سنی ہوگی؟“ اس نے کہا ”خداوندا! مجھے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ شاید کہیں آسمان ٹوٹا یا بادل گرجا۔“

پھر شیر بولا کہ ”تو اس میں کیا صلاح دیتا ہے؟“ اس نے جواب دیا کہ یہ صلاح وقت نہیں کہ یکایک اپنا مقر چھوڑ دیجیے یا نڈر بیٹھیے۔ اگرچہ دشمن ہے، پر اب ذرا دیکھو تو تمہارے ان نوکروں سے کیسی خدمت ہوتی ہے۔ نوکر اور جورو اور رفیق اس کو

کہتے ہیں، جو وقت پڑنے پر کام آویں اور وے اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔" وہ بولا "جو تو کہتا ہے درست۔ اب کچھ ایسی تدبیر کیا چاہیے کہ اس کی آواز سے میرے دل میں جو دھڑکا پہنچا ہے، سو نکل جاوے۔" اس نے کہا۔ "جہاں پناہ! جب تک میری جان میں جان ہے، مطلق کسی نوع کا خطرہ اپنے دل میں نہ لائیے اور اگر حکم ہو تو کرٹک، جو میرا بھائی ہے، اس کو بھی حضور کی خدمت میں حاضر کروں کہ آنا اس کا بہتر ہے، کیوں کہ وہ بڑا عقلمند و زور آور ہے۔ ایسے وقت میں ویسے نوکر کا بلانا مناسب ہے۔" شیر نے کہا۔ "بہت اچھا"۔ اسی وقت اکثر جانور اس کے اشارے سے کرٹک کو بلانے دوڑے اور بادشاہ کی خدمت میں اس کو لا حاضر کیا۔

بادشاہ نے اس وقت دمنک کو خلعت وزارت کا دے کر بہت سی مہربانی اور شفقت ان دونوں کے حال پر فرمائی۔ تب کرٹک نے دمنک سے کہا۔ "اے بھائی! یہ انعام اور خلعت جب حلال ہو کہ ہم بھی نمک حلالی کر دیں۔" پھر دونوں بادشاہ کے حضور میں آداب بجا لائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اب کیا کہتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: "اگر جی کی امان پاویں اور حکم ہو تو جستجو سے اس کا احوال دریافت کریں کہ وہ ایسا کون ہے کہ جس نے خداوند کی سلطنت میں دخل کیا۔" یہ بات سن کر شاہ نے ان کو رخصت دی۔

جب وے کھوج کو نکلے تو راہ میں کرٹک نے کہا۔ "بھائی! جس سے شیر ڈرا ہے اور تو بھی اس کی ہیبت کا مقر ہے، اس سے سوال و جواب اور برابری کیوں کر کرے گا؟ جو چیز کہ ممکن نہ ہو، اس کا قبول کرنا خیالِ فاسد ہے۔" دمنک نے کہا۔ "اے نادان! بادشاہ کے روبرو جو دانا ہیں تو وے دور اندیشی سے رائی کو پربت کر دکھاتے ہیں اور اپنی داڑھی کی حرمت رکھتے ہیں۔" کرٹک نے کہا کہ جو شاہوں کی نگاہ لطف سے نہال ہوتے ہیں، سو اس کی چشمِ غضب سے خرابی بھی دیکھتے ہیں۔ چاہیے یوں کہ جتنا کوئی کر سکے اتنا ہی قبول کرے۔ دمنک بولا کہ وہ ایسا ایک جانور ہے کہ گیدڑ کو بھی نہیں مار سکتا۔ تب وہ کہنے لگا کہ بھلا وہ کتنے روز سے بادشاہ اسی فکر میں تھا۔ تو نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ دمنک بولا کہ "بھائی! اگر اس کو وحشت نہ ہوتی اور میں پہلے ہی کہہ دیتا تو مجھے وزیر کیوں کرتا اور تجھے کیوں بلاتا۔ حق تعالیٰ نے یہ حیوان اس جنگل میں ہمارے نصیبوں سے بھیجا ہے اور بعضے بزرگوں کی یہ خو ہے کہ کے وقت خواہاں ہوتے ہیں اور نہیں تو بات بھی نہیں پوچھتے، اپنے ہی حال میں خوش رہتے ہیں۔ چنانچہ جب آدمی کو مچھر کاٹتے ہیں تب وہ دھواں کرتے ہیں تا کہ وہ اس کی کڑواہٹ سے جاتے رہیں۔ اس بات کو یقین جانو کہ بے غرض کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔

آخر وے دونوں بھائی سنجوگ کی طرف گئے۔ کرٹک ایک درخت کے نیچے بیٹھا اور سر اٹھا کر مونچھوں کو تاؤ دینے لگا اور دمنک سنجوگ کے پاس جا کر کہنے لگا کہ اے بیل! تجھ میں کیا تاب و طاقت اور تیزی، کیا بساط اور مجال۔ اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو میرے ساتھ کرٹک کے پاس چل کہ وہ بادشاہ کا خاص ملازم ہے۔ اور نہیں تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ اس ڈر سے وہ اس کے ساتھ ہو لیا اور کرٹک کے نزدیک جا کر سلام کیا۔ وہ تیوری چڑھا کر کہنے لگا۔ "اے نادان تو کون ہے جو اتنی دلیری کی کہ بدون حکم بادشاہ کے (کہ جس کا میں وزیر ہوں) اس جنگل میں آیا؟ ابھی حکم کروں تو تیری کھال کھینچی جاوے۔" سنجوگ ڈرا اور تھرتھرا کر کہنے لگا کہ مجھ سے بڑی خطا ہوئی، جو تم سے ہو سکے تو میری تقصیر معاف کرواؤ۔ کرٹک نے کن انکھیوں سے دمنک کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو میرے پاؤں پر ڈال دے۔ دمنک نے سنجوگ کا کان پکڑ کرٹک کے پاؤں پر ڈالا۔ اس نے کہا کہ اگر بھلائی چاہتا ہے تو میرے ساتھ بادشاہ کے حضور چل۔

بیل نے کہا۔ "اگر تجھ کو بادشاہ کے حضور میں لے چلتا ہے تو میری جان بخشی کروا دے۔" تب کرٹک نے نہایت مہربانی سے اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا کہ تو اپنے دل میں کچھ خطرہ نہ کر کیوں کہ کیسی ہی سخت ہوا چلے پر کسی گھاس کو نہیں گراتی، مگر بڑے درختوں کو، اس واسطے کہ گھاس نے جو اپنے تئیں پائے مال خلائق کا کیا ہے، اسی عاجزی اور انکساری کی برکت سے صحیح و سلامت رہتی ہے اور درخت اپنے تئیں بڑا جانتے ہیں، اسی سبب جڑ سے اکھڑ پڑتے ہیں۔ سن اے بیل! بادشاہوں کا بھی خواص ہے۔ تو بھی اس عاجزی سے میرے ساتھ بادشاہ کے روبرو جاوے گا، تو نہایت سرفراز ہوگا۔

جب بادشاہ کی ڈیوڑھی کے نزدیک پہنچے، تب اس کو دروازے پر کھڑا کر کے وہ دونوں بھائی بادشاہ کے حضور گئے اور آداب بادشاہی بجا لائے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ جس کام کے واسطے تم گئے تھے، کچھ اسے دریافت کیا کہ نہیں؟ دمنک نے عرض کی کہ خداوند! جیسا آپ نے فرمایا تھا اس سے زیادہ دیکھنے میں آیا، لیکن اس کو ہم ایک تقریب اور فریب کی ڈوری سے باندھ لائے ہیں اور وہ قدم بوسی کی آرزو میں دروازے پر کھڑا ہے۔ شیر نہایت خوش ہو کر پھول بیٹھا اور کہا۔ "لے آؤ!" دونوں گیدڑ گئے اور ہاتھ پکڑ کر اسے حضور میں لے آئے اور مجرا کروایا۔ بادشاہ نے اس کو مہربانی کا خلعت دیا اور اس کے رہنے کے واسطے ایک جگہ مقرر کروا دی۔ وہ اس میں رہنے لگا اور دمنک و کرٹک کو روپے اشرفیوں کے توڑے کے توڑے بخشے اور خدمت خزانچی گری کی کرٹک کو دی اور دونوں کو پاس بٹھا کر پوچھا کہو اس کو کیوں کر لائے؟ دمنک نے عرض کی۔

"خداوند! میں نے اس کی ناک میں عقل کے نشتر سے سوراخ کیا اور نرم باتوں کی رسی سے ناتھ کر حضور میں پہنچایا اور میں ہمیشہ جہاں پناہ کا کام جان و دل سے اس واسطے کرتا ہوں کہ خداوند روز بروز میرے حال پر مہربانی زیادہ فرماویں۔ اور اگر کوئی دشمن میری طرف سے پیر و مرشد کے دل میں بدی ڈالے تو اغلب کہ غلام کی طرف سے خاطر مبارک میں گرد کدورت کی نہ بیٹھے اور شفقت میں تفاوت نہ آوے جیسا کہ راج کنور اور بنیے کی دوستی میں ایک بڑھیا عورت نے ادنا حرکت سے جدائی ڈالی۔ شیر نے پوچھا۔ "اس کا قصہ کیوں کر تھا؟" دمنک نے کہا۔

نقل کرپا کنور اور دھنپت چوپڑباز کی

"میں نے یوں سنا ہے کہ دھودا گر ایک پہاڑ ہے اس کے نیچے ایک ندی بہتی ہے پانی اس کا صاف سفید کافور سے زیادہ خوشبو ہے۔ اس کے کنارے پر ایک بوندی نام شہر بستا ہے۔ اس شہر میں ایک راجا تھا کہ اس کے باورچی خانے میں ہر روز سو من نمک خرچ ہوتا تھا؛ اس سے اور جنس کا اندازہ کیا چاہیے کہ کتنی کچھ خرچ ہوتی ہوگی۔ اس کا ایک لڑکا تھا، نام اس کا کرپا کنور، نہایت شفقت سے اس کو کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرتا، جو حرکت اس سے ہوتی اس کے نزدیک خوش آیند تھی اور اس کا دل کسی بات سے آزردہ نہ کرتا۔

ایک دن اس نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا کوئی اچھا چوپڑباز اس شہر میں

ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ دھنپت نام ایک بنیے کا بیٹا خوب کھیلتا ہے۔ اگر حکم ہو تو اس کو لا دیں۔ کہا "جلد لاؤ" تب لوگوں نے بقال کی ڈیوڑھی پر جا کر دستک دی۔ وہ گھر سے نکلا اور کنور کے لوگوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ڈرا اور پوچھا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ تم ہرگز اپنے دل میں نہ چنتا نہ کرو۔ راج کنور نے تم کو چوسر کھیلنے کو بلایا ہے۔ دھنپت جڑاؤ چوسر سونے روپے کی نردوں سمیت اور کچھ جواہر بیش قیمت اپنے ساتھ لے کر ان کے پاس حاضر ہوا اور اس کی خوب صورتی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سلام کر کے اس جواہر میں سے کچھ اس کو نذر گزرانا۔ اس نے اس کی نذر قبول کر کے چوسر بچھوا کھیل شروع کیا۔ بڑی دیر تک کھیلا کیے، پر برابر سرابر ہی رہے۔ جب وہ رخصت ہو کر جانے لگا، تب کنور نے ایک اشرفی اس کو بطور انعام دے کر کہا کہ تو ہر روز ہمارے یہاں آیا کر۔ وہ ہمیشہ آتا اور چوسر کھیلا کرتا اور اشرفی روز اسی صورت سے لے جاتا۔

اسی طرح بہت سے دن گزرے۔ ان دونوں میں یہاں تک اخلاق ہوا کہ کنور بھی اس کے گھر جانے لگا۔ چنانچہ وہ دونوں آٹھ پہر ایک ساتھ ہی رہنے لگے اور وہ ایسا کھیل میں غرق ہوا کہ کھانے پینے کی سُرت بھلا دی۔ بلکہ خبر گیری ملک و لشکر کی اور دیکھنا بھالنا ہاتھی گھوڑے مال خزانے کا ایک قلم دل سے اٹھا دیا۔ جب یہ اطوار اپنے لڑکے کے راجا نے دیکھے، تب اس نے غمگین ہو کر دیوان سے یہ بات کہی کہ یہ لڑکا ملک کو برباد کر دے گا۔ کوئی ایسا شخص اس شہر میں ہے کہ اس میں اور اس لڑکے میں جدائی ڈال دے؟ دیوان نے تدبیر تو بہت سی کی کہ ان دونوں کی دوستی میں خلل پڑے پر کچھ پیش رفت نہ گئی۔

بعد دو تین برس کے ایک عورت مکارہ نے راجا کو آ کر سلام کیا اور کہا کہ اگر مہاراج کہیں تو میں ان دونوں میں بات کہتے دشمنی ڈال دوں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا "یہ کام مشکل ہے، سچ کہو کہ کتنے عرصے میں کتنی محنت اور کس قدر روپے خرچ کرنے سے ہو سکے گا؟" بولی۔ "مہاراج! جو کوئی دوستی اور نیکی کیا چاہے تو وہ نہایت محنت و مشقت سے حاصل ہوتی ہے، لیکن دوستوں میں دشمنی اور بدی ڈالنی بہت سہج ہے۔" پھر اس نے کہا کہ تو یہ کام کے دن میں کرے گی؟ وہ بولی کہ ایک پل میں، یہ بات سن کر دل میں متعجب ہوا اور ایک بیڑا دے کر بدا (وداع) کیا۔

یہ یہاں سے وہاں گئی جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے اور سامنے ان کے کھڑی ہو کر بیٹے کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا اور ہاتھ سے بلوایا۔ وہ کنور کا منہ دیکھنے لگا۔ اس نے کہا "جاؤ، دیکھو تو کیا کہتی ہیں" وہ اس کے پاس آیا۔ کٹنی نے اس کے کان کے پاس اپنا منہ لگا جھوٹ موٹ کھسر پھسر کر رستا پکڑا۔ وہ بیچارا کنور کے نزدیک پھر آ بیٹھا۔ اس نے پوچھا "کہو بڑھیا تمہارے کان میں کیا کہہ گئی؟" بقال بچے نے قسم کھا کر کہا "کچھ نہیں۔"

اسی ردوبدل میں دو چار گھڑی کا عرصہ گزرا۔ کنور نے کہا "کیا بُرا وقت ہے۔ جو کوئی کسی کے حق میں بھلائی کرے تو گویا اپنے واسطے بُرائی۔ وہ عورت میرے روبرو تجھ سے کچھ کہہ گئی اور تو مکرتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تیوری چڑھائی اور اس سے علیحدہ ہو کر اپنے لوگوں سے کہا کہ اس بڑھیا کو پکڑ لاؤ۔ جو کچھ کہہ گئی ہے اُسی سے معلوم ہوگا۔ اتنے میں وہ کٹنی پھر اس کے پاس آ بیٹھی۔ نوکر چاکر جو اس کے دوڑے تو اس مکارہ کو اس کے پاس پکڑ لے گئے۔ کنور نے پوچھا ـــ "بڑھیا! سچ کہہ تو کون ہے؟" اس نے کہا "میں اُسی کے باپ کی قدیم نوکر ہوں۔ اس نے مجھے بھیجا تھا کہ تو دھنپت سے جا کر آہستہ سے پوچھ کر کنور کو تو نے کھلایا، کہ نہیں؟" اس نے کٹنی سے پوچھا "وہ کیا چیز ہے؟" وہ بولی کہ میں نہیں جانتی، وہ شیرینی یا کچھ اور کھانے کی چیز ہوگی۔

یہ سن کر اُسے رخصت کیا۔ آپ من میں سوچنے لگا کہ اگر اس کے باپ نے کچھ اچھی چیز میرے کھانے کے واسطے کہی ہوتی تو دھنپت مجھ سے ہرگز نہ چھپاتا اور اتنی قسمیں نہ کھاتا، اب اس قرینے سے مجھے خوب معلوم ہوا، کہ سوائے زہر کے اور کوئی چیز کھلانے کو نہ کہی ہوگی۔ یہ گمان اپنے دل میں لا کر غصے ہوا۔ اپنے لوگوں سے کہا کہ بقال بچے کو میدان میں لے جا کر جلد گردن مارو تا کہ ایسے بُرے کا پھر کبھی میں منہ نہ دیکھوں۔ تب انہوں نے اس غریب کو وہاں لے جا کر ناحق ذبح کیا۔"

جہاں پناہ! ایسی ایسی باتوں سے مجھے کمال خطرہ ہے کہ مبادا کوئی میرا بدخواہ کچھ جھوٹ موٹ تہمت لگا دے تو میرا حال بھی اسی کا سا ہو وے۔ پیر مرشد! دانا وہ شخص ہے کہ دشمن کے کہنے سے اپنے دوست کی بُرائی نہ چاہے اور بدخواہ کو پہچانے اور اس کے کہنے پر ہرگز عمل نہ کرے۔" شیر نے ہنس کر کہا ؎

خدا نے لکھا جس کا جوبن وسال
ڈسے سانپ اس میں نہ کھاوے ببر
نہ پانی کا خطرہ، نہ آتش کا خوف
پھرے گو کہ تنہا بن میں جوں شیر نر

اے دومنک! تو اپنے دل میں ہرگز کسی چیز کا اندیشہ نہ کر، اپنے کام سے ہر وقت ہوشیار خبردار رہ۔

غرض جب دومنک اور کرٹک نے بادشاہ کے یہاں سے خلعت سرفرازی اور جان کی امان پائی، رخصت ہو کر خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنے گھر کو آئے۔ اسی طرح ایک مدت تک دونوں بھائی وزارت اور خزانچی گری کرتے رہے، اور بادشاہ کی مہربانی ان پر روز بروز زیادہ ہوتی رہی۔ سنجوگ رفتہ رفتہ اپنے درجے سے یہاں تک گرا کہ خدمت گاروں میں رہنے لگا۔ نہ بادشاہ اس کو بلائے، نہ یہ حضور میں مجرے کو جانے پائے۔ اس لیے نہایت مغموم رہا کرے۔

ایک دن پنڈکرن بادشاہ کے بھائی نے چاہا کہ میں شکار کو جاؤں۔ اتفاقاً اس روز سنجوگ کہیں پاس کھڑا تھا۔ یہ بات سنتے ہی روبرو بادشاہ کے عرض کی کہ اتنا شکار کل آیا تھا، کیا وہ سب خرچ ہو چکا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اس کو دومنک اور کرٹک جانیں۔ اس نے پھر التماس کیا کہ حضرت! اس کو دریافت کیجیے کہ اس میں سے کچھ باقی ہے کہ نہیں۔ تب بادشاہ مسکرا کر کہنے لگا کہ کل پہ کیا موقوف ہے، ہم ہر روز شکار لاتے ہیں جو ہمارے دن رات کے ناشتے اور کھانے سے بچتا ہے، دومنک کرٹک لے جاتے ہیں۔ کچھ آپ کھاتے ہیں، کچھ فقیروں کو کھلاتے ہیں۔ وہ بولا کہ خداوندا! یہ بات خیرخواہی اور عقل سے بعید ہے کہ بدون حکم آپ کے یہ لے جاویں اور بادشاہی خزانے میں کچھ پس انداز نہ کریں۔ پیر مرشد! نوکر ایسا چاہیے کہ خاصیت کوٹھی کی رکھے۔ وہ ایک ظرف ہے، کچی مٹی سے بناتے ہیں۔ اکثر اناج رکھنے کے لیے اس میں ایک ہی بار بہت سا غلہ اوپر سے بھر کے بند کر دیتے ہیں اور تھوڑا تھوڑا موکھے کی راہ سے موافق احتیاج کے نکال نکال

خرچ کرتے ہیں اور نوکر ایسا نہ چاہیئے کہ جو کوئی اُسے اپنے گھر کا مختار کرے یا کچھ اسباب بطور امانت کے سونپے، وہ اسے غفلت سے برباد دیوے، یا کھو کھنڈا بیٹھے، یا سب کا سب کھا جاوے۔

خداوند! خزانے کو بادشاہ اپنی جان کے برابر سمجھتے ہیں کیونکہ اگر خزانہ ہے تو لشکر بھی جمع ہو سکتا ہے، جو پیسا نہ ہو تو فوج نہ رہے، اور فوج نہ ہووے تو ملک ہاتھ سے نکل جاوے، اور یہ سخت عیب ہے کہ بادشاہ خزانے کی خبر نہ لے، کس واسطے کہ چار چیزیں خزانے کے حق میں زبوں ہیں: ایک تو تھوڑی آمد بہت خرچ، دوسرے غافل رہنا، تیسرے آپ سے جدا رکھنا، چوتھا لوٹ کا مال خزانے میں داخل کرنا۔

یہ بات سن کر پنڈ کرن نے بادشاہ سے کہا کہ دومنک اور کرمنک کو اپنے اپنے گھر کا بالفعل یہاں تک مختار کیا ہے کہ تمام خزانہ اور لشکر ان کے قابو میں ہے۔ جو اسی طرح سے ان کے ہاتھ میں رکھو گے تو یقین ہے ایک دن وے سر اٹھاویں گے اور مخالف بنیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ خزانہ ان کے ہاتھ سے نکال لیجیے اور سنجوگ کے حوالے کیجیے۔ صرف کام وزارت کا ان دونوں کے ذمے رہے جیسا کہ کہا ہے کہ تین شخص کو خزانے کا مختار نہ کیجیے۔ ایک تو اپنے کو، دوسرے سپاہی کو، تیسرے جو وقت پر اپنے کام آیا ہو، کیونکہ اگر اپنے کو سونپیں گے تو اپنایت جان کر کھا جاوے گا، اور کہے گا کہ میرا کیا کریں گے اور مجھ سے لیں گے۔ اگر اس کو ستاویں تو تمام خلقت اُپنے ہی تئیں بُرا کہے گی اور لوگ کہیں گے کہ واہ! اپنوں سے خوب سلوک کیا۔ اگر سپاہی کے حوالے ہوگا اپنی تروار کے زور سے سب چٹ کر جاوے گا، ایک کانی کوڑی نہیں گھس لگانے کو نہ دے، اگر مانگو گے تو لڑنے کو موجود ہو۔ تیسرے وہ جو وقت پر کام آیا ہو، جو اسے دیجیے تو وہ بھی ہضم کر بیٹھے، اس بات پر کہ جس کا مال ہے، وہ میرا احسان مند ہے۔ اگر اس سے لینا چاہیں تو ہر ایک سے کہے کہ میں نے اس سے فلانی جگہ یہ سلوک کیا اور وہ مجھ سے بے مروتی کرتا ہے۔

اے بادشاہ! سوائے ان تین شخصوں کے خزانچی گری یا اور کام (کہ جس سے آقا کو فائدہ ہو) کسی کو سپرد کرے اور اس کو بھی خوب سا دریافت کرے اور دیکھے کہ بادشاہی خزانے میں سے خرچ کرتا ہے یا نہیں، اگر اپنے خرچ میں لاتا ہے تو اس کو بھی کام نہ دیجیے۔ اگر کام دیا ہے تو اسے معزول کیجیے تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔

بادشاہ نے کہا کہ بھائی! جو تم کہتے ہو سو سچ ہے میں بھی جانتا ہوں۔ دومنک و کرمنک نے کچھ ہاتھ پاؤں پھیلائے ہیں اور کبھی کبھی عدول حکمی کرتے ہیں۔ پنڈ کرن بولا کہ "بزرگوں نے کہا ہے کہ وزیر عقل مند اور مدبر چاہیئے کہ اسباب و اجناس ہر طرح کی مہیا رکھے تو وہ وزارت کے قابل ہے۔ یہ بات میں آپ کی خیر خواہی سے مصلحتاً کہتا ہوں، اور دانا کو ایک اشارہ بس ہے۔ چناں چہ میں آگے بھی عرض کی تھی خزانہ سنجوگ کے حوالے کیا چاہیئے، کس واسطے کہ وہ گیدڑ گوشت کے کھانے والے ہیں اور یہ بیل گھاس چرنے والا ہے۔

بادشاہ نے یہ بات قبول کی اور اُسے خلعت بخشی گری کا دیا اور خزانہ بھی حوالے کیا۔ جب دومنک اور کرمنک نے اس مجلس کا رنگ اور بادشاہ کی گرما گرمی کی گفتگو دو چار دن کے پیچھے کسی طرح معلوم کی، تب آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو ہم نے اس بیل کو بادشاہ سے ملا دیا اور وہ ہمارے ہی اکھاڑنے کے درپے ہوا۔ اگر اُسے ہم بادشاہ کے پاس یوں نہ لے جاتے تو اس کی نظروں سے کیوں گرتے اور یہ آفت ہم پر کیوں آتی۔ ہمارا کیا ہمارے ہی آگے آیا اور اس بات کو اب کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے۔ کیا کیجیے، جی ہی میں مسوس مسوس کر رہیے۔ مثل مشہور ہے، "چور کی ماں کوٹھی میں سر ڈال کر روئے۔" یہ روداد گندہرب، کنیت اور نندو نائی اور سادکنوار کے قصے کی ہے کہ اپنے کیے سے ذلیل و خوار ہوئے ویسا ہی ہم نادم و پریشان ہوں گے۔ کرمنک نے کہا کہ وہ قصہ کیونکر ہے؟ دومنک بولا:

نقل گندہرب، کنیت اور نندو نائی اور سادکنوار کی

یوں سنا ہے کہ کنچن پور نام ایک شہر ہے۔ اس میں راجا بیر کرما جیت رہتا تھا۔ اس کے نائب نے اپنے لوگوں کو ایک روز حکم کیا کہ نند حجام کو مقتل میں لے جاؤ۔ گندہرب، سادکنوار اور حجام کے قصے سے واقف تھا، اس واسطے ان کے پیچھے تماشا دیکھنے کو ہو لیا۔ جب وہ لوگ قتل گاہ میں پہنچ کر اس حجام کی گردن مارنے لگے، تب گندہرب نے اس کا ہاتھ پکڑ اپنے پیچھے کر لیا اور کہنے لگا کہ یہ حجام واجب القتل نہیں ہے، کیونکہ احوال اس کا اور قصہ سادکنوار کا دونوں ایک سال میں اور میں اس سے خوب واقف ہوں۔ نائب کے آدمیوں نے پوچھا کہ وہ کیونکر؟ اور تو کون ہے اور کیا جانتا ہے؟ گندہرب نے کہا کہ میں بنارس کے راجا کا بیٹا ہوں جو سنگل دیپ کا حاکم تھا۔

ایک دن میں اپنے باغ کی بارہ دری میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک سوداگر بچہ کشتی سے اتر کر میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کچھ حقیقت دریا کے سفر کی بیان کر۔ اس نے کہا کہ میں نے جہاز پہ ایک عجیب تماشا دیکھا ہے۔ اگر میں تجھ سے کہوں، خدا جانے تو باور کرے یا نہ کرے کہ دریا میں پانی کے اوپر ایک صندل کا درخت ہے اور اس درخت اور اس کے نیچے ایک جڑاؤ پلنگ بچھا تھا اور اس پہ ایک عورت خوب صورت بیٹھی تھی کہ یک بہ یک میرے کان میں آواز آئی اس کا نام رتن منجری ہے۔ مجھ کو دیکھ کر جو ہنسی تو موتی سے دانتوں کی جھلک سے تمام دریا روشن ہو گیا۔ اس سے زیادہ اس کی تعریف کیا کیجیے۔ جس دن سے کہ میری آنکھ اس سے لگی ہے، اس دن سے ایک پل بھی آنکھ نہیں لگتی اور وہی صورت میری آنکھوں میں آٹھ پہر پڑی پھرتی ہے اور دل میں ایسی گڑی ہے کہ ہوش و حواس بالکل جاتے رہے ہیں۔ اگرچہ فقیر ہو گیا ہوں پہ اس کی یاد میں خوش رہتا ہوں، اور کبھی اس کو نہیں بھولتا، بلکہ جس طرح دیکھا ہے وہی نظر آتی ہے۔ جب میں نے سوداگر بچے کی زبانی یہ احوال اور تعریف اس کے دانتوں کی سنی، تب ایک حالت سکتے سی ہو گئی۔ پھر بعد ایک پہر کے مجھ کو ہوش آیا۔ اسی گھڑی اس کے دیکھنے کے اشتیاق میں جہاز پہ سوار ہوا۔ جس جگہ سوداگر بچے نے اس کا پتا دیا تھا، ادھر ہی گیا۔ چند روز کے بعد وہاں جا پہنچا، اور جتنی خوبیاں میں نے اس کی سنی تھیں، اس سے زیادہ دیکھیں اور یہ چاہا کہ اس کو میں اپنے گلے سے لگا لوں، وہ نہیں رتن منجری چارپائی سمیت پانی میں رہی میں بھی اس کے پیچھے کود پڑا۔ ایسا دیکھتا ہوں کہ ایک شہر نہایت آباد ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کو کنگ بن کہتے ہیں۔

یہ سن کر میں کچھ آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سونے کا محل جڑاؤ جگمگا رہا ہے اور اس کے اوپر رتن منجری بناؤ کیے ہوئے بیٹھی ہے۔ میں اس کو دیکھتے ہی خدا کی درگاہ میں سجدہ کر کے خوش ہوا اور دل میں کہا کہ اللہ نے مجھ کو جیتے جی بہشت میں داخل کیا۔ اور اس نے جو مجھے دیکھا تو لونڈیوں کو بھیج کر بلوا لیا اور محبت سے تعظیم و تکریم سے اپنے پاس بٹھلا کر پوچھا کہ اے شخص! تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس بات کو سن کر میں نے کہا کہ میں سنگل دیپ کے راجا کا بیٹا ہوں اور مجھے گندھرب کہتے ہیں لیکن اب تیرا غلام ہوں۔

رتن منجری نے کہا کہ نہیں بلکہ میں تیری لونڈی ہوں اور تو میرا میاں ہے، بہ شرطیکہ تو ایک بات سے باز رہے اور اس کے سوا جو تیرا جی چاہے، سو کرے۔ میں نے کہا کیا کہتی ہو کہو۔ تمہارا کہنا بہ سر و چشم قبول کیا۔ جس چیز کو منع کرو گی ہو نہ کروں گا۔ رتن منجری نے کہا کہ یہ تصویر جو اس محل میں کھنچی ہوئی ہے، کبھی تو اسے ہاتھ نہ لگانا۔ میں نے کہا کہ ہاتھ لگانے کا تو کیا ذکر ہے بلکہ میں تو اس کے پاس بھی نہ جاؤں گا۔ یہ سن کر رتن منجری مجھ سے دل و جان سے پیار کرنے لگی۔

چند روز اس کے باعث سے میرے عیش و عشرت میں گزرے۔ ایک دن میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ ذرا اس تصویر کو دیکھیے کہ وہ کیسی ہے۔ غرض اس کے پاس گیا تو ایک صورت عجیب و غریب دکھلائی دی۔ بے قرار ہو کر اس کی چھاتی پر ہاتھ ڈالا۔ جوں ہی میرا ہاتھ اس کی چھاتی تک پہنچا، وہیں اس نے ایک لات ایسی ماری کہ میں کوہ قاف میں جا پڑا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ وہ بستی ہے، نہ مکان، نہ رتن منجری۔

غرض اس خرابی سے بن پھرتے پھرتے تمہارے شہر میں آ نکلا ہوں۔ جب آفتاب غروب ہوا تب میں ایک کے گھر میں اترا اور کچھ کھا پی کر سو رہا۔ پہر سوا پہر رات گئی ہوگی، جو میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک غیر شخص اہیرنی سے مشغول ہے کہ اتنے میں اہیر شراب کے نشے میں سرشار آ پہنچا۔ اس نے پاؤں کی آہٹ سے معلوم کیا کہ اہیر آیا۔ وہ وہیں دبے پاؤں بھاگا۔ اہیر تاڑ گیا کہ کوئی اہیرنی کے پاس تھا۔ جاتے ہی اس کے جھونٹے پکڑ کر خوب ہی لتیایا اور سائبان کے کھمبے سے کس کر باندھا اور آپ سو رہا۔ گھڑی ایک کے بعد کٹنی چرنا نائن کٹنی آکر اسے کہنے لگی کہ تیرا یار مار حلوائی کی دکان کے پیچھے کھڑا روتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ آج میرے پاس نہ آوے گی تو اپنے پیٹ میں چھری مار دوں گا۔ گوالن بولی: "تو دیکھتی نہیں میں کس حالت میں گرفتار ہوں۔ بھلا اس کے پاس کیونکر جاؤں۔ آج میرے خاوند نے مجھے مار کر اس ستون سے باندھا ہے، جو کھلی ہوتی تو سر کے زور جاتی؟"

نائن نے کہا "میں تجھے کھول دوں؟" وہ بولی۔ "جو اس عرصے میں میرا شوہر جاگے اور کھمبا خالی دیکھے تو خدا جانے اس سے زیادہ مجھے کیا اذیت دے" اس نے کہا۔ "خیر جو آج تو اس کے پاس نہ جاوے گی تو کل اسے جیتا نہ پاوے گی۔" اہیرنی بولی۔ "جو تیری رضامندی اسی میں ہے تو میں نے قبول کیا لیکن تو میرے بدل بندھی رہ اور جب لگ (تک) کہ میں وہاں سے پھر آؤں تب لگ (تک) ہرگز نہ بولنا۔"

نائن نے اسے کھول دیا، اس کی جگہ اپنے تئیں بندھوا لیا، وہ اپنے یار کنے گئی۔

جب دو چار گھڑی رات باقی رہ گئی تب اہیر چونکا تو اٹھ کر اس کو کھمبے سے کھول ساتھ سلا کر کہا کہ میں نے تیری تقصیر معاف کی اور تم بھی قسم کھاؤ کہ پھر ایسا برا کام نہ کرو گی۔ کئی بار اس نے یہی بات کہی۔ یہ بات سن کر دم کھا رہی۔ دل میں سمجھی کہ اگر بولوں گی تو یہ پہچان جائے گا۔ میں شہر میں بدنام ہو جاؤں گی۔ اسی ڈر سے اپنی آواز اسے نہ سنائی۔ گوالے نے جب یہ دیکھا کہ یہ سوگند نہیں کھاتی، تب جانا کہ اس کے دل میں حرام زندگی بھری ہوئی ہے، یہ اس کام سے باز نہ رہے گی۔ خفا ہو کر پھر اسے کھمبے سے کس کر باندھا اور ناک اس کی کاٹ لی۔ آپ چارپائی پر سو رہا۔

گھڑی دو ایک میں اہیرنی اپنے یار کے پاس سے آئی اور آہستہ آہستہ نائن سے پوچھنے لگی۔ "کہو بی بی! میرے پیچھے تم پر کوئی حادثہ تو نہیں پہنچا؟" وہ بولی۔ "کیا پوچھتی ہے تیری خاطر میری ناک کٹ گئی۔" اسی وقت اسے تو کھول دیا اور اپنے تئیں بندھوا لیا۔ یہ تو نکٹی ہو کر دل میں پچھتائی ملوے کھاتی اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے پیچھے اہیر کی آنکھ کھلی اور وہ بھی پیٹنے لگی۔ تب یہ کہنے لگا کہ اے نابکار! تو نے اپنی بدکاری سے توبہ نہ کی اور ناک کٹوائی۔ وہ بولی۔ "اگرچہ تو نے مجھ بے قصور پر زور و ظلم کیا لیکن تو دیکھ جو میں بھلے آدمی کی جنی اور نیک بخت ہوں تو رام جی کی دیا سے نکٹی نہ رہوں گی۔ میری ناک جیسی کی تیسی ہو جائے گی۔ اس کی بات سنتے ہی وہ اٹھا۔ ناک جوں کی توں دیکھ کر حیرت میں رہا۔ جی میں کہنے لگا کہ یہ عورت نیک زنوں سے ہے جو اس کی ناک کٹی ہوئی پھر درست ہو گئی۔ یہ سمجھ کر پٹکا گلے میں ڈال، اس کے پاؤں پر گر، منتیں کرنے لگا اور اپنی تقصیر معاف کروانے لگا اور بولا کہ میں نے ناحق تجھے دکھ دیا؛ یہ میری خطا معاف کر، پھر کبھی تیری اذیت کا روادار نہ ہوں گا۔

یہ کہہ کر گندھرب نے کہا۔ "اے یار! میں اس اہیرنی کے مکر سے تو حیران تھا ہی، پھر دل میں یہ خیال کیا کہ اس نائن کا اب تماشا دیکھیے کہ وہ اپنے خاوند سے کیا بہانہ کہے گی۔

غرض میں منہ اندھیرے اس کے گھر کی دیوار کے کونے لگ کر کھڑا ہو رہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حجام باہر سے اپنے گھر آیا، آنگن میں کھڑا ہو کر اپنی عورت سے آئینہ مانگنے لگا۔ اس نے پٹ کی اوٹ سے نہرنی ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑا دی۔ اس نے کہا۔ "میں آئینہ مانگتا ہوں، یہ لے اسے لا دے۔" پھر استرہ لا دیا۔ اس نے وہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خفا ہو کر کہا کہ کچھ تو دیوانی ہوئی ہے یا تو نے معجون کھائی ہے۔ میں آئینہ مانگتا ہوں اور تو کچھ کا کچھ لے آتی ہے۔ یہ کہہ کر پکار پکار کر کہنے لگا کہ میں ابھی اس استرے سے تیری ناک کاٹ ڈالتا ہوں۔ یہ بات اس کے سب محلے والوں نے سنی اس نے وہ استرا باہر سے گھر پھینک دیا۔ وہیں وہ رو رو کر کہنے لگی کہ ہے ہے! اس استرے سے میری ناک کٹ گئی۔ اس آواز پر تمام محلے کے رہنے والے دوڑے اور آ کر وہ دیکھنے لگے تو سچ مچ اس کی ناک کٹی دکھائی دی۔ اور وہ حجام بھی اس حالت کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ عذر خواہی کر کے کہنے لگا کہ۔۔۔

بی بی! یہ مجھ سے بڑی تقصیر ہوئی ہے، معاف کر۔۔۔ اس بات کو سن کر بلبل کے نوکروں نے کہا کہ اے گندھرب! تیرا اور نائن کا قصہ ہم نے سنا اب ساد کٹوند کی کہانی کا بیان کر۔۔۔

نقل سادکنور اور پنڈکی کسی کی

اس نے کہا کہ سادکنور بڑھئی بچہ تھا اور کروڑ روپے کا مال لے کر اپنے گھر سے تجارت کرنے کو نکلا اور چودہ برس سوداگری ہی کرتا رہا، اور کئی کروڑ روپے جمع کر کے اپنے گھر کو چلا۔ اتفاقاً راہ میں ایک شہر ملا کہ اسے کام رو کہتے ہیں۔ یہ وہاں گیا اور سنا کہ ایک عورت پنڈکی نام کی اس شہر میں ایسی حسین رہتی ہے کہ جس کی خوب صورتی کی تعریف بیان سے باہر ہے، اور کمر اس کی ایسی پتلی کہ ویسی کسی عورت کی نہ ہو گی۔ ایک رات کی چوکی کے ہزار روپے لیتی ہے۔ یہ سن کر نہایت بے قرار ہوا۔ دل میں کہنے لگا کہ اگر اس عورت کو میں نہ دیکھوں گا تو قیامت تک افسوس رہے گا۔ ہزار روپے اپنے ساتھ لے کر اس کے یہاں گیا۔ تمام رات عیش و عشرت میں مشغول رہا۔ یہ ارادہ کیا کہ کئی شب اس کے پاس اور بھی رہے۔ جب رات نے اپنا دامن سمیٹا اور سورج نے صبح کے گریبان سے منہ نکالا، تب سادکنور اپنے گھر آیا۔

اسی طرح سے کئی رات آیا جایا کیا۔ اس رنڈی کے گھر میں کاٹھ کا ایک جڑاؤ پتلا طلسم کا بنا ہوا، نام کا عجیب پیشانی پر اس کی ایک لعل بے بہا جڑا ہوا تھا۔ کہ جس کی روشنی کے باعث چراغ کی حاجت نہ تھی۔ اس کو دیکھ کر سادکنور کا دل للچایا اور اپنی خاطر میں یہ بات لایا کہ اس عورت نے میرے بہت سے روپے لیے ہیں ان کے عوض یہ جواہر بیش قیمت لیجیے اور یہاں سے چپکے سے چل دیجیے۔

اس رنڈی نے جو اس کے بشرے سے دریافت کیا کہ یہ اس جواہر کو مفت اڑایا چاہتا ہے، یہ سمجھ کر اس کے پاس سے سرک گئی اور ایک پردے کی آڑ میں جا بیٹھی۔ اس نے جو اتنی فرصت پائی تو چارپائی سے اٹھ کر ہاتھ دوڑایا کہ اس ہرشب چراغ کو اکھیڑ لے۔ جوں ہی اس کا ہاتھ اس تک پہنچا وہیں (وہیں) اس پتلے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ کسی تدبیر سے اپنا پنجہ چھڑا کر بھاگے۔ لیکن اس نے اور بھی گھبکر پکڑا کہ یہ بے قابو ہو گیا۔ ندان جب چھڑا نہ سکا تو گھبرا کر چلانے لگا۔ تب لونڈیوں نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنی بی بی سے (جو پردے کو گئی اسی واسطے بیٹھی تھی)، جا کہا۔

"لو نہ بی بی! تمہاری مراد بر آئی۔"

یہ خوش خبری سنتے ہی وہ وہاں سے دوڑی آئی۔ آکر دیکھا کہ دام میں سونے کی چڑیا پھنسی ہے۔ ہنس کر کہنے لگی کہ اے سادکنور! میں جانتی تھی کہ تو کسی بڑے آدمی کا لڑکا ہے، اور یہ نہ سمجھی تھی کہ تو ایسا اچکا دغاباز ہے۔ دیکھ ابھی کوتوالی کو خبر کرتی ہوں۔ وہ تجھے لے جا کر کل سولی دے گا۔

ایسے چور کی سزا یہی ہے۔ یہ سن کر وہ بہت ڈرا اور اپنی کوتہ اندیشی پر ہزار لعنت و ملامت کی۔ پھر منت و التجا سے کہنے لگا کہ اے پنڈکی! کسی طرح تو مجھے کوتوالی کی سولی سے بچا لے۔ وہ بولی کہ ایک صورت سے تیری جان بخشی ہو سکتی ہے اگر تو تمام مال و اسباب اپنا مجھ کو منگا دے اور پھر اس کا دعویٰ مجھ سے نہ کرے، ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو۔ اس نے دیکھا کہ سوائے اس کے میرا چھٹکارا نہیں، تب اس نے اپنے لوگوں کو بلوا کر کہا کہ میرا اسباب مال و متاع اس کے حوالے کرو، نہیں تو میں اس کے ہاتھ سے مارا جاتا ہوں۔ انہوں نے تمام نقد و جنس جو کچھ تھا، اس عورت کو لا دیا۔ تب اس نے اس کا ہاتھ چھڑا دیا تو وہ غریب راتوں رات بھاگ کر کسی طرف چلا گیا اور میں رفتہ رفتہ تمہارے ملک میں آنکلا۔ یہ سب احوال راجا کے نوکروں نے سن کر حجام کو چھوڑ دیا۔

یہ قصہ دونک نے کرتک سے کہا کہ جیسے گندھرب اور سادکنور اور حجام نے عورتوں کے ہاتھ سے ذلت کھینچی، ویسی ہی ہم نے بھی اس بیل سے۔ اب کچھ ایسی تدبیر کیا چاہیے کہ جس ڈھب سے شیر اور بیل میں دوستی کروائی تھی، ویسی ان دونوں میں دشمنی ڈلواؤں۔ کرتک نے کہا: "یہ امر نہایت مشکل ہے، کیا تو نے نہیں سنا کہ سیتا باوجود کہ رام کی جورو تھی، اس سے کچھ نہ ہو سکا؟" دونک نے پوچھا "کیوں کر" اس نے کہا۔

نقل سیتا، رام اور اس کی بہن کی

اگرچہ وہ قصہ طول و طویل ہے۔ لیکن مختصر کر کے کہتا ہوں۔ سیتا رام اور اس کا بھائی لچھمن ان تینوں نے بارہ برس تک ایک جنگل میں گزران کی۔ جب لنکا میں راون نے یہ بات سنی تو اس جنگل سے سیتا کو اڑا لے گیا۔ رام پھر بڑی محنتوں سے اس کو وہاں سے لایا۔ جتنی عزت اس کے آگے تھی اتنی ہی رہی۔ کچھ اس کی آبرو میں بٹہ نہ آیا۔ اور اپنے دل کو اس کی محبت سے ہرگز نہ پھیرا۔ اس کی بہنیں جو سیتا کو دیکھ نہ سکتی تھیں آپس میں صلاح کی کہ کچھ ایسی فکر کیا چاہیے کہ اس کی محبت بھائی کے دل میں نہ رہے۔ ایک اس میں سے اٹھ کر دوسری سے کہنے لگی کہ دیکھ ابھی میں تجھے اس کا تماشہ دکھاتی ہوں یہ کہہ کر بھائی کے گھر گئی وہ اس وقت چوپڑ کھیلتا تھا۔ یہ جاتے ہی بھاوج سے ٹھٹھا کرنے لگی۔ اور ہنستے ہنستے اس سے پوچھا کہ تجھے کچھ یاد ہے راون کی شکل کیسی تھی؟ سیتا بے چاری اس کے مکر چکر سے واقف نہ تھی۔ سدھاوٹ سے بولی۔ راون کے دس سر، بیس آنکھیں اور سو انگلیاں تھیں۔ پھر وہ کہنے لگی کہ اس کی تصویر تو ذرا کھینچ میں دیکھوں کہ وہ کیسا تھا۔ اس بدذات کے کہنے سے یہ نیک بخت بے خوف و خطر سفید مٹی سے زمین میں اس کی صورت کا نقشہ کھینچنے لگی۔ اس میں وہ مکارہ بولی کہ جب تک تو کھینچے میں اپنے لڑکے کو دودھ پلا آؤں۔ یہاں سے دوڑی ہوئی جہاں رام چوپڑ کھیلتا تھا چلی گئی۔ جاتے ہی کہا ذرا اپنی جورو کا تماشہ چل کر دیکھو۔ یہ کہہ کر بھائی کا ہاتھ پکڑ لائی۔ جہاں سیتا وہ نقشہ کھینچ رہی تھی۔ کہا۔ دیکھو جو اس نے اسے نہیں دیکھا اور اس سے نہیں ملی تو اس کی تصویر کھینچ کر کیوں دیکھتی ہے۔ یہ دیکھ اور سن کر رام کو بہت غیرت آئی منغص ہو کر کہنے لگا کہ سیتا! تجھے جان سے کیا ماروں تو عورت ہے اور رنڈی کو مارنا مرد ہو کر خوب نہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔

کرتک نے یہ داستان سنا کر کہا کہ عورت کی محبت میں رام نے دریا پر پل باندھ کر لنکا کو جلایا اور سونے کے کوٹ کو توڑا اور اسے خاک سیاہ کیا اور راون کو مارا، لیکن اپنے گھر سے ایسی پارسا عورت کو ایک دم میں رنڈی کے بہکانے سے نکال دیا۔ دونک نے کہا وہ کون سی بات ہے جو مکر و حیلے سے نہیں ہو سکتی۔ سیتا نیک بخت تھی اپنے خاوند کی آبرو کے لیے کچھ نہ بولی۔ اگر بدکار ہوتی تو جیسا کہ ایک مالن نے اپنے خصم کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کے روبرو ایک یار کو نکال دیا اور دوسرے کو نہلا دھلا کھلا پلا اس کے ساتھ کر کے تھوڑی دور تک بستی سے باہر پہنچا دیا۔ ویسا ہی وہ بھی کرتی۔ کرتک نے کہا کہ وہ نقل

کیوں کر ہے؟ دمنگ بولا ۔۔۔

نقل ایک مالن اور اس کے یاروں اور اسکے خصم کی

دوار کا نگری میں ایک مالن ایک رنڈی بدکار، کوتوال اور اس کے بیٹے سے رہتی تھی۔ ایک دن کو ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے لڑکے سے برے کام میں مشغول تھی کہ اتنے میں کوتوال دروازے پر آیا، اور کواڑوں کو کھٹکھٹایا۔ تب اس نے لڑکے کو جلدی سے کوٹھی میں چھپایا۔ اور اس کو دروازے پر سے اپنے پاس بلایا اور فی الفور ہم کلام ہونے لگی؛ قضا کار وہیں اس کا خاوند بھی دروازے پر آن پہنچا۔ تب رنڈی نے کوتوال کو سکھلایا کہ میں تو پٹ کھولنے جاتی ہوں پر تم لٹھ کاندھے پر دھرے، بڑبڑاتے، خفا ہوتے باہر چلے جانا میں پیچھے بات بنالوں گی۔ اس نے ویسا ہی کیا۔ تب مالی نے گھر میں آکر اس سے پوچھا کہ آج ہمارے گھر میں رات کو کوتوال کیوں آیا تھا۔ اور خفگی کس بات پر کرتا چلا گیا! مالن بولی کہ اس کا بیٹا اس سے آزردہ ہو کر یہاں چھپا ہے اور وہ اس کو ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔ اس نے جو اپنا بیٹا یہاں نہ پایا تو کچھ بکتا ہوا چلا گیا۔ یہ کہہ کر اس نوجوان کو کوٹھی سے نکالا۔ اور نہلا دھلا کھلا پلا اپنے خصم کو اس کے ساتھ کر کے تھوڑی دور اسے پہنچوا دیا۔ اور رخصت کے وقت کہہ دیا کہ یہ گھر اپنا ہی سمجھو۔ جب تمہارا جی چاہے۔ تب آیا کیجیو۔

اس لیے کہ میں کہتا ہوں کام پڑے پر جس کی عقل بحال رہے وہی عاقل ہے۔ پھر کرٹک نے کہا بھائی ان دونوں میں بڑی دوستی ہے، تم کیوں کر چھڑاؤ گے۔ دمنگ بولا کہ یار! جو کام تدبیر سے ہوتا ہے سو زور سے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کوّے نے سانپ کو جان سے کھوایا، سنو گے کیا حال ہے کہ میں اس کو اس کے رتبے سے گرا سکوں گا۔ پھر کرٹک نے پوچھا کہ وہ قصہ کیونکر ہے، دمنگ بولا ۔۔۔

نقل ایک کوّے اور سانپ کی

درخت پر ایک جوڑا کوّوں کا مدتوں سے رہتا تھا۔ اور اسی درخت کی جڑ کے کھنڈلے میں بڑا سا کالا سانپ رہا کرتا۔ کوّے کی مادہ نے اپنے گھونسلے میں انڈے دیئے اور کوا سینے لگا۔ بعد میں بائیس روز کے بچے نکلے۔ جب مہینے ایک کے بچے ہوئے، تب وہ سانپ اپنی جگہ سے نکلا اور آہستے آہستے اس درخت پر چڑھا۔ کوا اس وقت وہاں نہ تھا، اس کے بچوں کو گھونسلے میں سے کھا لیا۔ ہر چند اس کی مادہ ایک دوسری ٹہنی پر بیٹھی ہوئی بہتیرا کاں کاں کیا کی اور بہت واویلا کرتی رہی پر اس کی داد کو کوئی نہ پہنچا اور کچھ فائدہ اس کی فریاد سے نہ ہوا۔ جب کوا باہر سے پھر آیا تو مادہ نے اس سے بچوں کی مصیبت اور اپنے کلپنے کا احوال کہا۔ یہ اس سانپ کا ظلم سن کر دونوں بچوں کے سوگ میں رہا اور بہت سا رویا دھویا کیا اور دانا پانی چھوڑا۔ تب اس گرد و نواح کے جتنے کوّے تھے، اس حادثے کی خبر سن کر سب آئے اور اسے جو اپنے جگر گوشوں کے ماتم میں ماتمی لباس پہن کر بیٹھ رہا تھا، تسلی دی اور اس کا ہاتھ منہ دھلا، کھانا پینا کھلا پلا رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ تب مادہ نے نر سے کہا، "اب یہاں رہنا خوب نہیں۔ صلاح یہی ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ دیجیے کہیں دوسری جگہ آرام کی اچھی سی دیکھ کر جا رہیے۔ کیوں کہ حکماء کہتے ہیں تین چیزوں سے انسان جلد مر جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جس کی عورت بے گانے مرد پر فریفتہ ہو، دوسرے یہ کہ رہنا اس گھر میں جہاں سانپ رہتا ہو، تیسرے یہ کہ دوستی کرنا احمق سے؛

کوّے نے کہا "اے ناقص عقل! تو اتنی بے قرار نہ ہو، بلکہ صبر کر، دیکھ تو میں تیرے بچوں کا بدلہ کیوں کر لیتا ہوں۔" وہ بولی "بد بخت تجھے میرے ساتھ اتنی جھوٹی باتیں کرنی نہ چاہیئیں۔ تیری عقل کی کیا رسائی ہے جو اس سے کچھ کام ہو سکے۔ اور ناداں میں ہزار طرح کی قوت ہو پر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا!" کوّے نے اس سے کہا۔ "تو نے نہیں سنا ہو خرگوش نے اپنی عقل کے زور سے شیر کو مارا!" وہ بولی "یہ بھی تو جھوٹ کہتا ہے۔ بھلا خرگوش شیر کو کیوں کر مار سکتا ہے۔ کوّے نے کہا۔

نقل ایک خرگوش اور شیر کی

سنڈکارن ایک جنگل ہے، وہاں اکثر اقسام طرح کے جانور رہتے تھے۔ اتفاقاً وروانت نام ایک شیر کسی پہاڑ سے نکل کر اس جنگل میں آرہا۔ ہر روز بارہ جانور وہاں سے مارتا، ایک ان میں سے کھاتا اور باقی سب چھوڑ کر چلا جاتا۔ جب دو تین مہینے اسی طرح گزرے تو بہت سے جانور مارے گئے۔ جب یہ صورت وہاں کے جانوروں نے دیکھی تو سب جمع ہو کر آپس میں کہنے لگے کہ اگر اسی طرح یہ شیر ہمیں مارا کرے گا تو کئی مہینے کے عرصے میں کوئی باقی نہ رہے گا، سب کو ٹھکانے لگا دے گا۔

آخر سب نے مل کر یہ صلاح کی کہ شیر کے پاس کسی شخص دانا کو بھیجا جائے کہ وہ جا کر یہ بات کہے کہ تمہارا پیٹ ایک جانور سے بھرتا ہے، پس اتنے جانوروں کا روز تم خون ناحق کیوں کرتے ہو؟ ایک جانور ہر روز ہم تمہارے کھانے کے لیے پہنچا دیا کریں گے۔ یہ بات تمہارے واسطے بہت اچھی ہے اور ہمارے بھی۔

جب آپس میں ان کے یہ صلاح ٹھہری کہ ایک گیدڑ کو یہاں سے یہ پیغام دے کر اس کے پاس بھیجیے۔ اس میں ایک خرگوش مجلس سے بول اٹھا کہ یارو! یہ بات گیدڑ سے ہرگز درست نہ ہوگی بلکہ یہ وہاں جا کر ہمارے برخلاف کہے گا، کیوں کہ جب سے یہ شیر اس جنگل میں آیا ہے۔ تب سے ہمارے گھروں میں ماتم اور گیدڑوں کے شادی ہوتی ہے۔ وہ جھنجھلا کر بولا کہ اگر میری وکالت تجھ کو منظور نہیں اور فتنہ انگیز جانتا ہے تو تو ہی جا اور اس معاملے کو بنا لا۔ تب خرگوش نے اس مہم کے واسطے کمر ہمت باندھی اور شیر کے نزدیک جا کر آداب بجا لایا۔ اس نے دیکھ کر پوچھا۔ "تو کہاں سے آیا؟" اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ خداوندا! اس جنگل کے تمام رہنے والوں نے مجھے بطور ایلچی کے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اور یہ عرض کی ہے کہ خود بدولت کو بہت جانوروں کو مارنے اور اذیت دینے سے کیا حاصل! ہم سرکار میں یہ اقرار نامہ لکھ دیتے ہیں کہ ہمیشہ ایک جانور آپ کی خوراک کے واسطے بلا ناغہ پہنچا کرے گا؛ اس میں ہرگز کبھی خلاف نہ ہوگا۔ شیر نے قبول کیا۔ خرگوش وہاں سے رخصت ہوا۔ اپنے جنگل کو پھر آیا، جو گفت گو اس کے اور اس کے درمیان ہوئی تھی، سو سب جانوروں کو سنا دی۔ ہر روز ایک گلے سے جانور شیر کے یہاں پہنچا کرتا۔

جب نوبت خرگوش کی پہنچی، اس نے اندیشہ کیا کہ اب کچھ ایسی تدبیر کروں کہ جس سے شیر کا لقمہ نہ ہوں۔ یہ خیال دل میں لا کر اپنے بچوں سے رخصت

ہوا۔ روتا ہوا شیر کی طرف چلا۔ تھوڑی دور جا کر راہ میں بیٹھا اور اپنے دل میں یہ فکر کرنے لگا کہ لوگ جسے دانا اور عقل مند کہتے ہیں۔ اگر میری عقل اس وقت کچھ کام نہ آوے تو جانئے تعجب اور محل افسوس کا ہے۔ وہاں سے اٹھ کر یہ خیال کرتا ہوا ہولے ہولے نزدیک شیر کے گیا۔ وہ بھوک کی جھانجھ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی غرانے لگا کہ تو نے آج اتنی دیر کیوں لگائی؟ میرے ناشتے کا وقت ٹل گیا اور بھوک نے مجھے بے تاب کیا۔

خرگوش ڈرتے ڈرتے کہنے لگا کہ اگر امان پاؤں تو کچھ کہوں۔ باگھ بولا "جو کہتا ہے سو جلد کہہ دے"۔ خرگوش کہنے لگا کہ میں چلا آتا تھا، راہ میں ایک شیر ملا، اس نے میرا پیچھا کیا، میں بھاگا اور پکار کر کہا کہ تو نہیں جانتا ہے کہ بادشاہ یہاں کا دوردانت ہے؟ میں اس کی خوراک ہوں، تو کون ہے کہ مجھے کھایا چاہتا ہے؟ بادشاہ سے نہیں ڈرتا اور اس کا خوف نہیں کرتا؟ تد (تب) وہ بولا کہ دوردانت کیا چیز ہے اور اس کی اتنی طاقت کہاں کہ وہ مجھ سے لڑے اور اب اس جنگل میں رہ سکے۔ تجھے میں نے اس واسطے چھوڑ دیا کہ تو جا کر اسے خبر کرے غریب پرور! میں نے آپ کو اطلاع کر دی، آگے مختار ہیں۔ شیر اتنی بات سنتے ہی غصے سے جل گیا۔ کہنے لگا تو مجھے اس کا ٹھکانا بتلا دے۔ یہ آگے آگے، شیر پیچھے پیچھے چلتے چلتے ایک ایسے جنگل میں گیا کہ جس میں ایک بڑا اکوا (کنواں) تھا۔ اس کنویں کے لب پر کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ آپ کا دشمن اسی میں ہے۔ جوں شیر کنویں کو جھانکا، تیوں اپنا عکس پانی میں دیکھا، جانا کہ وہ یہی ہے۔ غضب ناک ہو کر بھبکنے لگا اور ویسی آواز کنویں سے نکلنے لگی۔ شیر خفگی سے بول کر اس کنویں میں کود پڑا اور وہ پانی میں ڈوب کر مر گیا۔

پھر کوے نے کہا کہ اے مادہ! جس طرح اس خرگوش نے اپنی عقل کے زور سے شیر کو مار کھپایا، اسی طرح میں بھی اس سانپ کو ماروں گا۔ مادہ نے کہا "اگر تجھ کو کچھ عقل ہے تو دیری نہ کر"۔ کوا بولا "دانش مندوں نے یوں کہا ہے کہ جلدی میں کوئی کام اچھا نہیں ہوتا ہے۔

جلدی نہ کر کہ کام ہے موقوف وقت پر
سادا انار ترش کے ہے وقت آئے سے اگر

ان شاء اللہ تعالیٰ آج تو میں اپنے دل سے مصلحت کرتا ہوں، کل اپنا کام کروں گا۔" مادہ نے کہا "اے کوے! جس کو جو کام کرنا ضرور ہوا اس سے وہ ہو سکتا ہو۔ اور وہ کہے کہ آج نہیں کل کروں گا، اس سے زیادہ دنیا میں نادان نہیں اس واسطے یہ مثال دلائی ہے۔ "شب حاملہ فردا چہ زاید" کوا یہ بات سن کر چیت گیا۔ وہ بولی "مناسب یہی ہے کہ ابھی تو یہاں سے جا اور سانپ کے مارنے کی تدبیر کر کیوں کہ وہ ہمارا جانی دشمن ہے۔"

کوا جو اڑا تو وہاں کے بادشاہ کے رنگ محل پر جا بیٹھا۔ اتفاقاً اس بادشاہ کی بیٹی غسل کرتی تھی اور اپنا نو لکھا ہار موتیوں کا گلے سے اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ کوا اس ہار کو اپنی چونچ میں لے کر کوٹھے کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ لونڈیوں نے غل مچا کر کہا کہ شہزادی کا ہار کوا اٹھا لے گیا اور کوٹھے پر جا بیٹھا۔ اس بات کے سنتے ہی بادشاہ نے لوگوں کو دوڑایا کہ خبردار! ہار جانے نہ پائے۔

جب کوے نے دیکھا کہ ایک خلقت میرے گرد جمع ہوئی تب وہ وہاں سے آہستہ آہستہ اڑتا ہوا اپنے گھونسلے کی طرف چلا۔ جتنے آدمی جمع ہوئے تھے، سو سب اس کے پیچھے پیچھے ہاں ہاں کرتے دوڑے۔ وہ اس درخت پر جا بیٹھا جس میں وہ سانپ تھا اور وہ لوگ بھی اس کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ اور آدمیوں کے شور و غل سے سانپ درخت پر چڑھ گیا اور کوے کے گھونسلے میں جا چھپا۔ تب کوے نے غنیمت جان کر وہ ہار سانپ کے گلے میں ڈالا اور آپ دوسرے درخت پر جا بیٹھا۔ دو چار آدمی کیا دیکھتے ہیں کہ ہار سانپ کے گلے میں پڑا ہے۔ اور وہ ان کو دیکھ کر اپنا سر اٹھا کر چاروں طرف پھنکاری مارنے لگا۔ وے لوگ اس کے ڈر سے ہار نہ لے سکے اور نیچے اتر آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ ہار سانپ کے گلے میں پڑا ہے، وہ غضب سے پھنکاری مار رہا ہے، ہمارا حوصلہ نہیں پڑا جو اس کے گلے سے اتار دیں۔ تب انہوں نے بڑھئی کو بلوایا اور وہ پیڑ جڑ سے کٹوایا۔ سانپ کو مار ہار بادشاہ کے پاس لے گئے۔"

پھر دمنگ نے کہا۔ "بھائی! کوے نے سانپ مارا اور خرگوش نے شیر۔ یہ بیل کیا چیز ہے جو میں اپنی عقل سے اس کو نہ مار سکوں گا" کرتک نے کہا "اے دمنگ! اگر تجھ کو مارنے کی طاقت ہے تو جا اس کام میں غفلت نہ کر۔"

دمنگ نے جب کرتک کی زبانی پائی تو تنہا سنجوگ کو بلا کر جھوٹ موٹ کہنے لگا کہ مجھے بادشاہ نے کہا ہے کہ تو سنجوگ کو جا کر کہہ دے کہ سرکار بادشاہی میں فوج کم ہے، اور خزانہ بہت۔ تو لشکر رکھنے کی ایسی فکر کر کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سپاہ رکھی جاوے۔ سنجوگ نے اس کی بات پر اعتماد کر کے دروازہ خزانے کا کھولا اور سپاہ رکھنے لگا۔

جب دمنگ نے دیکھا کہ سنجوگ نے فوج رکھنے کے پیچھے سارا خزانہ بادشاہی صرف کیا، تب شیر کے پاس جا کر آداب بجا لایا اور اپنے پاسے پر کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا کہ جہاں پناہ! ان دنوں کچھ عجائب تماشا نظر آتا ہے۔ بہ جناب عالی کے روبرو عرض نہیں کر سکتا ہوں۔ کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو کوئی بن بلائے کسی کے گھر جاوے یا بن پوچھے بات کہے تو اس کے برابر احمق نہیں۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ میرا وہ حال نہ ہو جو استاد سے شاگرد کا ہوا۔ شیر نے پوچھا۔ "وہ قصہ کیوں کر ہے؟" دمنگ نے کہا،

نقل استاد اور شاگرد کی

میں نے یوں سنا ہے کہ لکھنوتی ایک بستی ہے۔ وہاں کسی معلم سے ایک لڑکا پڑھتا تھا، اور میاں جی اس کا افیمی۔ جب افیم اتر جاتی تو اسے نیند آتی اور اونگھنے لگ جاتا۔ اگر اس حالت میں کوئی اسے کچھ کہتا یا شاگرد کوئی لفظ سبق کا پوچھتا تو خفا ہو کر شاگرد کو خوب مارتا۔ اور کہتا کہ اے بیوقوف! اول مکتب میں ادب سیکھا چاہیے کہ جس کے باعث بہت سے کام نکلتے ہیں۔ غرض ہر روز شاگرد کو یہی تاکید کیا کرتا تھا۔ کہ اگر پھر کبھی بغیر پوچھے مجھ سے کوئی بات کی یا مجھے سوتے سے جگایا تو لاتیں مارتے مار ڈالوں گا۔ شاگرد نے توبہ کی کہ پھر ہرگز ایسا کام نہ کروں گا۔ ایک دن رات کو چراغ اپنے سامنے رکھ کر اسی شاگرد کو پڑھا رہا تھا، اتنے میں اسے جو پینک آئی تو شملہ اس کا چراغ کی لو پر جا پڑا اور پگڑی جلنے لگی۔ گرمی جو اس کو پہنچی تو چونک کر شاگرد کو کہنے لگا کہ اے بدذات! تو دیکھتا تھا کہ پگڑی میری جلتی ہے۔ مجھے کیوں نہ جگا دیا؟ یہ کہہ کر اس کو بہت سا مارا۔ اس نے رو رو کر کہا کہ آپ ہی نے مجھے منع کیا تھا، سونے کے وقت مجھے مت جگائیو۔ اور بے پوچھے بزرگوں کی بات میں نہ بولیو کہ بے ادبی ہے، اس واسطے میں نے آپ کو نہ جگایا۔ آخوند جی نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ

میں نے اس بات کو منع نہیں کیا تھا کہ کسی کا نقصان اپنے سامنے ہو اور وہ اسے خبر نہ کرے اور بیٹھا دیکھا کرے۔

پھر دمنک نے کہا کہ خداوند! میرا اور آپ کا قصہ اس استاد اور شاگرد کا سا ہے۔ اگر کہوں تو بے ادبی۔ اور جو نہ کہوں تو سرکار کا نقصان ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ میں نے تجھے اپنا وزیر اسی واسطے کیا جو تو دیکھے سو حضور میں ظاہر کرے۔ اگر تو نے کچھ دیکھا ہے تو کیوں نہیں کہتا! خصوص جس میں کہ سرکار کا فائدہ ہو اسے چھپانا نہایت نامناسب ہے تب اس نے عرض کی، جو غلام حضور میں ظاہر کرے اگر اسے باور کیجیے تو مفصل گوش گزار کرے۔ شاہ نے اشارہ کیا کہ "ہوں"۔ دمنک بولا کہ خداوند! سنجوگ باغی ہوا ہے کیوں کہ جناب عالی کے بے حکم اوپر ہی اوپر فوج رکھتا ہے اور وہ آپ بھی زور آور ہے۔ سوائے اس کے سرکار کا خزانہ اس کے ہاتھ ہے۔

اس بات کے سنتے ہی بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا اور کئی جاسوس اسی وقت اس کا احوال دریافت کرنے کو مقرر کیے۔ انہوں نے دو چار دن بعد اس کا احوال موافق اظہار دمنک کے حضور میں ظاہر کیا۔ تب دمنک بولا۔ کہ پیر و مرشد! مقدمے کی صورت میں یوں ہے جو آپ نے سنی، غلام نے خلاف نہیں عرض کیا۔ اب آپ مختار ہیں۔ جیسا مناسب جانیے ویسا کیجیے۔ تب شیر نے دمنک سے کہا اگر میں اس کو مار ڈالوں تو ساری خلقت مجھے کہے گی کہ یہ کیا بادشاہ ہے کہ جس کو بُلا کر خلعت سرفرازی کا دیتا ہے پھر اسے مار ڈالتا ہے یہ بات میرے حق میں موجب بدنامی کا ہے۔

دمنک نے عرض کی کہ خداوند! غلام کی عقل ناقص میں یوں آتا ہے کہ بالفعل اس کو خزانے کی خدمت سے تغیر کیجیے اور دوسرے کو اس کی جگہ بحال اور اس کے کھانے کے لیے کچھ تھوڑا سا مقرر کر دیجیے کہ جس سے اس کے بدن کا زور کم ہو جاوے بادشاہ نے دمنک کے کہنے سے فرمایا کہ سنجوگ سے کام چھین لیں اور راتب کم کر دیں۔ تب دمنک حضور سے رخصت ہوا اور بادشاہی دروازے پر آ کر دربان سے کہا کہ حضرت کا حکم یوں ہے کہ سنجوگ آج کی تاریخ سے بے حکم ہمارے حضور میں نہ آنے پاوے۔ یہ کہہ کر اپنے گھر گیا اور سنجوگ کو جا کر کہا کہ بادشاہ نے تیرے حق میں یوں فرمایا ہے کہ بے ہمارے بلائے حضور میں وہ نہ آوے اور فوج کے رکھنے میں مشغول اور سرگرم رہے۔ جب بہت سی نگہداشت کر چکے، تب حضور میں آوے، وہ بیل بے وقوف اس وزیر دغاباز کی بات کو سچ جان کر خوشی خوشی سپاہ رکھنے لگا اور کئی روز حضور میں مجرے کو نہ گیا۔ تب دمنک نے قابو پا کر دربار میں کسی سے بادشاہ کو سنا کر پوچھا کہ سنجوگ کئی دن سے یہاں نہیں آیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ وہ بولا کہ مجھے نہیں معلوم دوہیں (وہیں) بادشاہ نے زبانِ مبارک سے فرمایا کہ وہ پانچ چار روز سے حضور میں حاضر نہیں ہوتا۔

دمنک نے کہا کہ بندے نے پہلے ہی جناب عالی میں عرض کی تھی کہ اس کے پاس دن بدن فوج جمع ہوتی ہے۔ یقین ہے کہ وہ آج کل آپ سے مقابلہ کرے۔ بادشاہ نے کہا۔ اے دمنک! اگرچہ اس کی بدذاتی جاسوسوں کی زبانی کچھ کچھ ہم سن چکے ہیں۔ تاہم تو جس کو عقل مند جانے اس کو وہاں جلد بھیج دے کہ قرار واقعی اس کا احوال دریافت کر کے ہم کو خبر دے۔

وہ ایک عقل مند چوہے کو جو اس کا یار جانی تھا۔ اپنے طور کی باتیں سکھا پڑھا رو برو بادشاہ کے لایا اور اسی کو اس مقدمے کی تحقیقات کے واسطے مقرر کروایا۔ جب یہ سنجوگ کے یہاں پہنچا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بہت سی تعظیم کی اور اپنے پاس بٹھایا۔ عطر و پان اس کے سامنے رکھوائے اور پوچھا کہ تمہارا آنا یہاں کیونکر ہوا؟ کہا۔ دمنک وزیر نے مجھے تمہارے پاس اس واسطے بھیجا ہے کہ سواری بادشاہ کی عنقریب ہے تم نے اب تک کچھ فوج رکھی ہے یا نہیں؟ اگر رکھی ہے تو بہت اچھا والا بادشاہ کو کیا جواب دو گے، جب وہ پوچھے گا؟ سنجوگ بولا۔ کہ میری طرف سے وزیر کی خدمت میں سلام عرض کر کے التماس کرنا کہ میں نے خداوند کے اقبال سے بڑی کثیر فوج جمع کی ہے۔ تھوڑے سے لوگ اور بھی رکھ لوں تو حضور میں حاضر ہوں۔

یہ کہہ کر کچھ اسے دے دلا کر بخوبی رخصت کیا۔ پھر وہ حضور میں حاضر ہوا اور آداب بجا لایا۔ تب حضرت نے پوچھا کہ میں نے جو تجھے وہاں بھیجا تھا سو تو نے کیا دیکھا؟ اس نے عرض کی پیر و مرشد! میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں کہ اس نے بہت لوگ رکھے ہیں اور اس کی بات چیت اور اوضاع اطوار سے اور اس کے بعضے ملازموں کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ آج کل خداوند کا سامنا کرے۔ یہ سنتے ہی شیر آگ کا بگولہ ہو کر دوڑا اور جھپٹ کر سنجوگ کی گردن توڑ ڈالی اور اس کا لہو پی گیا۔

بعد اس کے وفاداری اور خوبیاں اس کی یاد آئیں۔ بہت سا افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میرا بڑا خیر خواہ نوکر تھا۔ میں نے اس کے مارنے میں عبث جلدی کی بہتر یہ تھا کہ اس کا احوال بتامل دریافت کر کے جو مناسب جانتا سو کرتا۔ دمنک نے کہا۔ خداوندا اب اس کے لیے پچھتانا عبث ہے کیونکہ یہ بات دنیا میں زبان زد ہے۔ کہ نہ ٹوٹا شیشہ بنتا ہے، نہ موا آدمی پھر جیتا ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ تم سے مقابلہ کر بیٹھتا تو تمام عمر اس رسوائی کا داغ تمہارے دل سے نہ چھوٹتا۔ خوب ہوا جو دشمن زبردست مارا گیا۔ اور اگر وہ آپ کے ہاتھ سے بچ جاتا تو آخر بدلا اس کا کبھو نہ کبھو تم سے لیتا۔ یہ سُن کر بادشاہ اپنے دیوان خانے میں آ بیٹھا اور کھانا کھانے لگا۔ تب دمنک نے یہ شعر حضور میں پڑھا۔

اگر تو بیج کو سو طرح سے لگاوے گا
پہ یاد رکھ تو کبھی اس سے پھل نہ پاوے گا

جب بشن سرما پنڈت نے دوسری کہانی متر بھید کی (یعنی اچھی دوستی میں بگاڑ کرانا) تمام کی تب راجہ کے بیٹوں نے کہا کہ مہاراج ہم نے یہ کتھا سنی اب تیسری نقل۔ بگرہ یعنی جنگ کی بیان کیجیے کہ اس کے سننے سے ہم مستفید ہوں۔

تیسرا باب

پنڈت نے کہا۔ یوں سنا ہے کہ کسی وقت خشکی اور تری کے جانوروں میں لڑائی ہوئی تھی۔ آبی جانوروں کا بادشاہ قاز اور خشکی کے پرندوں کا ہدہد تھا۔ باوجود قاز کا لشکر زیادہ تھا پر ہدہد نے اپنی دانائی اور تدبیر سے اس پر فتح پائی۔ راجہ زادوں نے پوچھا کہ مہاراج! وہ کیوں کر ہے؟ اسے مفصل بیان کیجیے۔

نقل قاز اور ہدہد کی

پنڈت کہنے لگا کہ ہندوستان میں ایک شہر ہے نام اس کا کرن پور۔ اس کے نزدیک ایک بڑی سی جھیل تھی کہ اس سے کئی ندیاں اور نالے نکلتے تھے۔ اس میں قاز بادشاہی

کرتا تھا اور مرغابی سے تا سرخاب اور بگلے سے جل کوّے تک اس کے حکم میں تھے۔ قاز ایک روز اپنے تخت پر خوش و خرم بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک بگلے نے آکر آستانہ بوسی کی اور آداب سے ہاتھ باندھ کر دور کھڑا ہو رہا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تجھے آج بہت دنوں پیچھے دیکھا۔ بگلا بولا کہ غلام گھر پر نہ تھا۔ ابھی ایک ملک سے چلا آتا ہے کہ وہاں کا احوال مجھ سے بیان نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کچھ کہا چاہیے۔ عرض کی کہ بیٹھے بیٹھے جو دل اکتایا تو جی میں یوں آیا کہ کہیں کی سیر کیجیے۔ جب گھر سے نکلا، پھرتے پھرتے دکن کی طرف جا نکلا وہاں ایک پہاڑ نظر آیا۔ اس کو دھولا گر کہتے ہیں۔ اس کے گرد میوہ دار درخت بہت دیکھنے میں آئے اور وہاں کے باشندوں سے یہ معلوم ہوا کہ یہاں کے پرندوں کا بادشاہ ہُدہُد ہے۔

میں نے اپنے جی میں ارادہ کیا کہ اگر اس سے ملاقات ہو جاوے تو کیا خوب اتفاق ہو۔ میں اسی سوچ بچار میں تھا کہ اتنے میں اس کے بھی دس بارہ نوکر وہاں آنکلے مجھ سے اور اس سے جو گفت گو درمیان ہوئی سو قابل اظہار کے نہیں۔ قاز نے کہا۔ تم شوق سے بے خوف و خطر جو دیکھا اور جو سنا ہے سو کہو، اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ مثل ہے کہ نقل کفر کفر نباشد۔ جب بگلے کی خاطر جمع ہوئی ادب سے بیٹھ کر کہنے لگا کہ اے خداوند! آتے ہی اس کے نوکروں نے مجھ سے پوچھا۔ تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ میں نے کہا کہ قاز بادشاہ کے خاص نوکروں میں سے ہوں اور بطریق سیر کے یہاں آنکلا ہوں۔ اب اپنے ملک کو چلا جاؤں گا۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ بولے کہ ہم ہُدہُد بادشاہ کے نوکر ہیں۔ جو اس وقت میں ویسا بادشاہ کوئی نہیں۔ میں نے کہا کہ اتنی بڑائی اور فخر کرنا کیا ضرور ہے۔ خدا کی قدرت معمور ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ تم سچ کہو کہ اپنے اور ہمارے بادشاہ میں کس کو بڑا جانتے ہو اور دونوں کے ملکوں میں سے کس کا ملک زیادہ آباد ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اے نادانو! کیا پوچھتے ہو۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی!

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کرن پور ہمارا وہ شہر ہے کہ بہتوں پر فضیلت رکھتا ہے اور ہمارے بادشاہ کا ثانی آج تک نہ کوئی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ پس اب بہتر یہ ہے کہ اس جنگل اور پہاڑ میں رہ کر کیا کرو گے؟ ہمارے بادشاہ کے یہاں چلو۔ اور تمہارے بادشاہ کی وہی مثل ہے کہ جہاں رُوکھ نہیں وہاں ارنڈی رُوکھ ہے۔ اگر ہمارے ملک میں کبھی تم آؤ اور اس کی بڑائی، آبادی اور بادشاہ کے عدل و انصاف کو دیکھو تو دنگ رہ جاؤ اور بہت محظوظ ہو پس اب بہتر یہ ہے کہ اس جنگل اور پہاڑ کو چھوڑو اور ہمارے بادشاہ کے یہاں چلو۔

اس گفتگو کو سنتے ہی وے چیں ابرو ہوئے اور رشک کی آگ میں جلنے لگے اور عداوت پر کمر باندھی جیسا کہ داناؤں نے کہا ہے کہ سانپ کے منہ میں شربت اور احمقوں کو نصیحت کڑوی لگتی ہے۔ اور ان باتوں سے مجھے کمال پشیمانی حاصل ہوئی جیسا کہ بعضے پرند جانور ایک بندر کو نصیحت کر کے پشیمان ہوئے۔ قاز نے کہا کہ اسے بیان کرو، وہ کیوں کر ہے؟ وہ بولا۔

نقل ایک بندر اور پرندوں کی

کسی پہاڑی میں ایک نالے پر بڑا سا درخت پاکڑ کا تھا، اس کی ٹہنیوں پر بھانت بھانت کے جانور گھونسلا بنا کر رہا کرتے۔ ایک دن ہر چہار طرف گھٹا امڈی اور بجلی چمکنے لگی اور مینہ چھما چھم برسنے لگا۔ جاڑے کا ایام تھا۔ سردی پر دانت پر دانت لگا بجنے اتنے میں ایک بندر کانپتا ہوا اس درخت کے نیچے آیا۔ ان جانوروں نے اس کی یہ حالت دیکھ اپنے دل پر ترس کھا کر کہا کہ اے بندر! دیکھ تو ہم کیا ایک مشت پر ہیں۔ اس جثے پر کس کس محنت مشقت سے ایک ایک تنکا گھاس کا چُن لاتے ہیں۔ اور اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ تب برسات کے موسم میں فراغت سے اپنے بچوں کو لے کر سکھ سے رہتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے تجھ کو ایسا جانور قوی بنایا ہے اور ہاتھ پاؤں دیئے ہیں۔ تجھ سے اتنا کام نہیں ہو سکتا کہ اپنے واسطے کوئی جگہ ایسی بنا رکھے کہ بارش میں پانی کی بوچھار سے سردی میں ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رہے؟ بندر نے جب یہ سنا، درخت کی بلندی پر نظر کی اور کہا۔ سبحان اللہ تم سکھ سے رہو اور ہم دکھ میں! جب مینہ کھلا بندر نے اس درخت پر چڑھ کر جتنے گھونسلے ان کے تھے۔ سب اجاڑ ڈالے اور بچے نیچے گرا دیئے۔

اے بادشاہ! بے وقوف کو بات بتانی اپنے اوپر اذیت اٹھانی ہے۔ میں نے ان کے بھلے کی نصیحت کی تھی، وے سمجھے کہ ہمارے بادشاہ کی اہانت کرتا ہے چاہتے تھے کہ مجھ کو پکڑ کر ماریں، میں اپنی عقل کے زور اور خداوند کے اقبال سے بچ نکلا تھا، لیکن اتنی بات جو میرے منہ سے نکل گئی کہ ہمارا بادشاہ کہتا ہے ہُدہُد کو کس نے بادشاہ بنایا؟ یہ بات سن کر وہ خفے ہوئے اور لات لگی کہنے لگے میں نے بھی دو چار کو خوب ٹھونکا۔

قاز نے کہا۔ اے نادان! عقل مند کو ہر کام میں تحمل کرنا بہتر ہے جیسا کہ شرم و حیا عورت کا زیور ہے۔ ویسا ہی تحمل مرد کی آرائش ہے۔ بگلا بولا۔ خداوندا! جب جورو اور خصم آپس میں لڑتے ہیں نہ عورت شرم کرتی ہے، نہ مرد تحمل۔ قاز نے کہا اے بگلے! دانا وہ ہے جو سمجھ کر کسی کام میں ہاتھ ڈالے اور جو کوئی اکیلا ہو کر زورآوروں کے ساتھ لڑتا ہے، رسوا ہوتا ہے۔ اگر تو اپنی زبان نہ کھولتا تو اتنی خفت نہ اٹھاتا جیسا کہ اپنی بے عقلی سے اس گدھے نے مار کھائی تھی اور رسوا ہوا! بگلے نے پوچھا کہ اس کا قصہ کیوں کر ہے، قاز نے کہا۔

نقل دھوبی اور اس کے گدھے اور ہرن کی

میں نے سنا ہے کہ دیپالپور شہر میں پارس ناتھ دھوبی تھا۔ قضا کار اس کے گدھے کی پیٹھ پر یونہی ایک زخم سا نمودار ہوا۔ کوؤں نے چونچیں ایسی ماریں کہ گدھا نپٹ مجروح ہو گیا۔ یہاں تک کہ کھانا پینا چھٹ گیا اور نہایت دبلا ہو گیا۔ دھوبی نے دیکھا کہ دو تین روز جو اس کی پیٹھ کھلی رہتی ہے تو کوے اسے مار ڈالیں گے۔ دھوبن سے کہا کوئی کپڑا ہو تو دے اس کے گھاؤ کو چھپاؤں۔ وہ بولی کہ شیر کا چھالا مدت سے ہمارے گھر میں یونہی پڑا ہے۔ کہو تو نکال دوں، اسے اس کی کمر پر ڈال دو۔ دھوبی نے خوش ہو کر گدھے کی پیٹھ پر گھاؤ کی حفاظت کے لیے باندھ دیا۔ دو تین اس کی شکل شیر کی سی دکھائی دینے لگی۔ تب وہ گدھا گھر سے نکل کر کھیتوں میں چر چگ کر کھانے لگا۔

لوگوں نے جب اس کی شیر کی سی صورت دیکھی جانا کہ یہ شیر ہے۔ گھر چھوڑ چھاڑ بھاگنے لگے۔ گدھے نے جو کسانوں کے کھیتوں کو رکھوالوں سے سونا پایا تو چند روز خوب سا کھا کر موٹا تازہ ہوا۔ اتفاقاً ایک روز کسی کھیت میں ایک ہرن چرتا تھا اس نے جانا کہ یہ شیر ہے، وہ بھاگنے لگا۔ گدھے نے اس سے کہا تو دہشت

میں شیر نہیں ہوں۔ ارادہ میرا یہ ہے کہ تجھ سے دوستی کروں۔ ہرن نے بھی دریافت کیا کہ واقعی یہ شیر نہیں گدھا ہے۔ خیر دونوں میں دوستی ہوئی۔ ایک ہی جگہ شب و روز رہنے لگے۔ فراغت سے بے روک ٹوک لوگوں کی کھیتیاں کھایا کریں، جنگلے بیلے جہاں چاہیں سیر کیا کریں۔

قضا کار ایک دن یہیں چرتے چرتے وے دونوں ایسے کھیت میں جا نکلے کہ وہ نہایت تر و تازہ اور سبز ہو رہا تھا اور ایک کسان بھی وہاں اس کی رکھوالی کے واسطے بیٹھا تھا۔ اس نے اس گدھے کو شیر شباہت میں دیکھا تو اس نے جانا کہ یہ باگھ ہے۔ اس کے ڈر سے کھیت کے پینار میں جا چھپا۔ یہ دونوں خاطر جمع سے اس کھیت میں چرنے لگے۔ یکایک گدھا وہاں خوش ہو کر رینکنے لگا۔ ہرن نے یہ مکروہ آواز اس کی سن کر اپنا چرنا چھوڑ کے ادھر کان رکھا۔ گدھے نے پوچھا۔

"یار! تو کس واسطے چرنا چھوڑ کر چپکا کھڑا ہوا ہے؟"

اس نے جواب دیا کہ تم میرے احوال کی کیا پوچھتے ہو، اپنے کام میں لگے رہو۔ گدھے نے اپنے سر کی قسم دی کہ بھائی! سچ کہو مجھ سے کون سی حرکت بے جا ہوئی کہ وہ تمہاری پریشانی کا موجب ہوئی۔ ہرن بولا اے یار! تیری خوشحالی نے میرے دل کو ٹھنڈا کر ڈالا۔ ایک عشق کی سی حالت میری آنکھوں کے آگے پھر گئی کیا ہی تو اس وقت خوش الحانی سے گایا کہ تیر عشق کا میرے دل میں ترازو ہو گیا۔ گدھا بولا کہ بھائی! مجھے اب تک مطلق معلوم نہ تھا کہ تمہیں بھی علم موسیقی سے کمال بہرہ ہے، نہیں تو میں تمہیں اکثر سنایا کرتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا، آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ میں تمہیں ہر وقت سنایا کروں گا۔ سنتے ہو یار! میں دنیا میں بہت پھرا ہوں پہ اپنے اس علم کا گاہک کسی کو میں نے نہ پایا جو اس کو اپنا ہنر دکھاؤں۔ پھر ہرن قسم دے کر پوچھنے لگا کہ سچ بتا تیرا استاد کون ہے؟ گدھے نے کہا کہ میں اوائل میں اکثر ندی کے کنارے جایا کرتا تھا۔ وہاں بہت سے مینڈک راگ کے چرچے میں رہا کرتے تھے۔ میں نے یہ سوز بڑی محنت سے سیکھا۔ یہ بات سن کر وہ بہت ہنسا اور کہا۔ کیوں نہ ہو جب تم ایسے بزرگوں کی خدمت میں رہے۔ تب ایسے صاحب کمال ہوئے۔ انشاء اللہ یہاں سے گھر پہنچ کر خاطر جمع سے میں سنوں گا۔ گدھے نے کہا۔ بھائی جو تم متوجہ ہو کر گھر میں سنو گے تو میں دل کھول کر گاؤں گا اور۔۔۔ اچھے اچھے دھرپد سناؤں گا۔ بالفعل اگر کہو تو آہستہ آہستہ تمہارے سامنے کچھ گاؤں؟ ہرن نے جواب دیا کہ اے یار! اگر تو اس وقت گا دے گا تو اپنی پردہ دری آپ ہی کرے گا۔ وہ بولا گانے والے کو تو جاں کندنی ہے اور سننے والے کو راحت۔ تو سنے گا میں گاؤں گا اس میں کیا برائی ہے؟ ہرن نے پھر صریحاً کہا کہ اس وقت بولنا تیرے حق میں ٹھیک نہیں۔ اسے کچھ عقل تو نہ تھی کہ اشارہ کنایہ سمجھے بلکہ وہ گدھا اپنی حماقت سے یہ سمجھا کہ اگر میں نہ بولوں تو یہ جانے گا کہ جھوٹا ہے۔ اپنے منہ کو کھول کر بڑے زور شور سے رینکنے لگا۔ ہرن اس کی مصاحبت سے متنفر ہو کر بھاگا۔ کسان جو چپکا خندق میں چھپا ہوا تھا اس کی آواز سن کر نہایت خوش ہوا اور جانا کہ یہ گدھا ہے۔ ایک لٹھ لے کر دوڑا اور پھر پھرا کر پانچ چار ہاتھ ایسے مارے کہ اس کا سر پھٹ گیا، کھوپڑی چور چور ہو گئی۔ پھر قاز نے کہا۔

اے بگلے! اس واسطے میں نے تجھ سے کہا کہ انسان کو لازم ہے کہ ہر وقت اپنی زبان قابو میں رکھے اور بات بیہودہ نہ کہے۔ اب سچ کہہ کہ تیرے اور ہدہد کے ذکروں کے درمیان اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تب بگلے نے عرض کی۔ جہاں پناہ! میں نے جتنی آپ کی خوبیاں اور شجاعت و سخاوت کی بیان کی۔ انہوں نے ویسی آپ کی اہانت اور نامردی ظاہر کی اور کہا کہ سوائے ہدہد کے کوئی دوسرا بادشاہ روئے زمین میں نہیں۔ قاز نے کہا۔ ان احمقوں کی وہ مثل ہے جیسا گدھا اور سؤر اپنے عیب و غرور سے کسی کو اپنے سامنے چیز نہیں سمجھتے مگر مست ہاتھی جب اس کے سامنے آ جائے تب اس کی بڑائی اور مٹائی دیکھ کر وہ گدھا اپنی بزرگی بھول جائے۔ جیسا کہ ایک کمینہ کسی بزرگ کی خدمت میں رہے اور وہ درجہ اس کا اپنی بد ذاتی سے نہ سمجھے۔ بگلے نے عرض کی جہاں پناہ! غلام نے بھی ان کی باتوں کا یہ جواب دکھا کر دیا کہ اب زمین کے تختے پہ ایسا کون ہے جو میرے خداوند نعمت کی برابری کرے۔ تب اس کے لوگوں نے کہا کہ تو جو ایسی بے دھڑک شوخی کی باتیں کرتا ہے، بدگفت گو تجھے نہیں پھبتی۔ مثل ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اگر تو اس بات چیت سے باز رہے تو تیرے واسطے بہتر ہے نہیں تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ میں نے ان کو کہا کہ میں لڑکا نہیں جو تمہاری ایسی دھمکی سے ڈروں۔ پھر بولے کہ سچ کہہ تو ہماری ولایت میں کیوں آیا ہے؟ میں نے کہا اس واسطے آیا ہوں کہ تمہارے شہر کو دیکھ کر اپنے شہر کو جا کر خبر کروں اور اس کو تمہارے ملک پر چڑھا لاؤں۔ یہ باتیں میری سن کر غصے سے جل گئے اور سب کے سب خفا ہوئے۔ اور سب نے مل کر میرے تئیں بہت مارا اور اپنے بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ انہوں نے کہا خداوند! یہ بڑا کھٹ بیجرا اور فتنہ انگیز ہے! پھر پوچھا یہ رہنے والا کس ولایت کا ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ خداوند! یہ قاز کے ملک میں رہتا ہے۔ اور اس نے اس شہر کا بھید لینے کے واسطے بھیجا ہے۔ اس کا ارادہ ہم کو اس کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ولایت کو بھی لیا چاہتا ہے۔

ہُدہُد نے کہا۔ پوچھو تو اس حرام خور اور شریر سے کہ تیرے بادشاہ کا کیا ارادہ ہے اور تجھے اس نے یہاں کیوں بھیجا ہے۔ غلام نے عرض کی کہ حضرت! میرے خداوند نعمت کا کئی برس سے ارادہ دلی یہی ہے کہ تمہارے ملک پر چڑھیں اور تم سے آ کر لڑیں۔ لیکن جو راہ باٹ سے واقف نہیں ہیں اس لیے اب تک توقف ہوا، سو اب میرے تئیں لشکر اترنے کی جگہ معلوم کرنے کو بھیجا ہے اور بندہ ان کے ملازموں میں سے ایک ادنیٰ ملازم ہے، اور یہ آپ نے سنا ہوگا کہ اگر بکری ہمارے بادشاہ کا آسرا لے تو کسی شیر کا مقدور نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اتنے میں کرگس نے جو وزیر اعظم ہدہد کا تھا، آگے مجھ سے پوچھا کہ تیرے بادشاہ کا وزیر کون ہے؟ میں نے کہا سرخاب، کرگس نے کہا۔ البتہ ایسے بادشاہ کا ایسا ہی وزیر چاہیے کہ ہم شہری ہوں، جیسا کہ داناؤں نے کہا ہے۔ اگر کوئی وزیر اپنا کرے تو اس کو لازم ہے کہ پہلے دریافت کرے کہ بزرگ زادہ اور عالم بے طمع اور ہم شہری اور صاحب ہمت ہو اور خدا کا خوف بھی دن رات اپنے دل میں رکھتا ہو۔ اس مجلس میں جو ایک طوطا دانا نام تھا اتنے میں اس نے آگے بڑھ کر اپنے بادشاہ ہدہد سے عرض کی کہ ملک قاز کا شامل صوبہ جات بادشاہی کے ہے چند روز سے قاز از راہ سرکشی کے باغی ہو اپنے تصرف میں لایا ہے۔ اگر اس پر کچھ فوج تعینات فرمائیے تو اقبال بادشاہی سے ہاتھ آنا اس ملک کا نہایت سہل ہے۔ یہ بات سن کر میرے تئیں ہنسی آئی اور میں نے کہا۔ "اے بادشاہ! ؎

جو باتوں میں سب کام میسر
نظامی قدم اپنا رکھتا فلک پر

اگر صرف اس توتے کے کہنے سے وہ ملک تمہارا ہو گیا تو ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ شہر

ہمارا ہے۔ الّو نے کہا۔

• اے بگلے برمحل جو ایک حجام جھوٹ بولا تو اُسے فائدہ ہوا۔ تو جو بے موقع جھوٹ کہتا ہے تجھے کیا نفع ؟"

پھر توتا بولا۔

• اے بگلے تجھ کو اتنا جھوٹ بولنے سے کیا حاصل ؟ تو نہیں جانتا کہ جھوٹی باتیں ایمان کو کھوتی ہیں۔ معاذ اللہ ! جس کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو، اس کی بات پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا اور اس کے کام کو کوئی پسند نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔

• سچ اور جھوٹ بولنا میرا تب تجھے معلوم ہو گا کہ میرے اور تیرے بادشاہ کے درمیان جب لڑائی ہو گی۔ خاطر جمع رکھو۔ چند روز میں تمہاری بربادی بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔"

یہ بات سن کر ہُدہُد ہنسا اور کہنے لگا کہ جاؤ اپنے بادشاہ کو خبر کرو کہ سامان لڑائی کا تیار کرے۔ میں نے کہا۔

• حضرت ! بادشاہ میری بات کو ہرگز باور نہ کرے گا۔ اگر تم کو لڑائی کی تاب و طاقت اور ارادہ ہے تو ایک ایلچی کے ہاتھ پیغام بھجوا دے۔"

ہُدہُد نے توتے کی طرف دیکھ کر کہا۔

• یہ کیا بکتا ہے ؟" اس نے عرض کی۔

• خداوند ! جو بات کہتا ہے معقول کہتا ہے۔ آپ کا دھیان اور طرف ہے۔"

تب ہُدہُد نے فرمایا کہ ہمارے ہاں قابل ایلچی گری کے کون ہے ؟ دریافت کرو۔ کرگس وزیر نے عرض کی۔

• جہاں پناہ ! ایسے شخص کو بھیجئے کہ جس میں علم اور راستی مسلم اور بے طمعی، صلاحیت اور ایمان داری، جرأت اور دلیری خلق اور دانائی، یہ سب وصف پائے جاویں اور جس بادشاہ کے روبرو جاوے، خوف اپنی جان کا نہ کرے اور سمجھ بوجھ کر جواب سوال کرے۔"

ہُدہُد نے کہا۔

• اس کام میں سوائے تیری میری خاطر جمع کسی سے نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تو جا اور جواب سوال کر آ۔"

کرگس بولا۔

• غریب نواز ! بندہ آگے ہی عرض کر چکا ہے کہ ایلچی اس شخص کو کیجیے جو دانا اور صاحب شعور، خوش تقریر ہو اور گفتگو کا سلیقہ بھی درست اور ہر ایک زبان میں مہارت رکھتا ہو اور بیہودہ گوئی نہ کرے اور ایسی بات نہ کہے کہ جس میں اپنے خاوند (خداوند) کی ہتک ہو اور بادشاہ کے کام میں اپنی جان کا صرفہ نہ کرے۔ یہ باتیں توتے میں پائی جاتی ہیں۔ اس کام کے لائق یہی ہے اور اسی کو بھیجا چاہیئے۔"

یہ بات سن کر سب حاضرین مجلس نے بھی پسند کی کہ واقعی سوائے اس کے اور کوئی ایسا نہیں کہ جس میں یہ سب صفتیں ہوویں۔ تب ہُدہُد نے توتے سے کہا۔

• تو بگلے کے ساتھ قاز کے پاس جا اور کہہ کہ تو جو اتنی شکوہ کرتا ہے۔ اور اپنے تئیں بادشاہ جہاں کہتا ہے، کیا میرا ڈر تیرے جی میں مطلق نہیں رہا اور اپنے تئیں اتنا بھولا کہ ہمسری کا دعویٰ کرنے لگا ؟ اگر تو اپنا بھلا چاہتا ہے تو شاہ ہُدہُد کی خدمت میں حاضر ہو اور عذر خواہی کر، یا کچھ تحفہ تحائف پیش کش کے طریق سے بھجوا۔ نہیں تو ہاتھی اور گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا جائے گا اور ملک تیرا ویران ہو جائے گا۔"

توتے نے عرض کی۔

• میں نے بادشاہ کا حکم سر کے زور قبول کیا۔ لیکن ایسے کم ظرف کے ساتھ جانا ہرگز مناسب نہیں۔ جیسا کہ اس ہنس نے کوے کی رفاقت میں اپنی جان دی، میں بھی وہی صورت اپنی دیکھوں گا۔"

ہُدہُد نے کہا کہ اس کا قصہ کیوں کر ہے ؟ توتا بولا۔

نقل ایک مسافر اور ہنس اور کوّے کی

• اجین شہر کے رستے میں ندی کنارے ایک بڑا سا درخت گولر کا تھا۔ اس کی ڈالیوں پر ہنس اور کوا دونوں بیٹھے تھے۔ اتفاق سے ایک مرد مسافر تیر کمان لیے ہوئے لُٹے دھوپ کے اس درخت کے تلے آ بیٹھا۔ راہ کی ماندگی سے اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بے اختیار سو گیا۔ جب آفتاب سر پر آیا اور دھوپ پتوں سے چھن کر اس کے منہ پڑی تب ہنس نے اس پر ترس کھا کر کوّے سے کہا۔

• اس بٹوہی کے منہ کو دھوپ لگتی ہے تو اپنے پر پھیلا کر اس ٹہنی پر جا بیٹھ کہ جہاں سے دھوپ اس کے منہ پر پڑتی ہے۔ کیوں کہ راہ کا تھکا ماندہ آیا ہے۔ ٹک آرام کرے۔"

کوّے نے کہا۔

• اگرچہ یہ کام ثواب کا ہے پر مجھے درکار نہیں جو میں اپنے اوپر اتنی محنت مشقت اٹھاؤں، یہ ثواب تو ہی لے۔"

ہنس اس کے فریب کو نہ سمجھا، وہیں اس ڈالی پر مسافر کے منہ پر چھاؤں کر بیٹھ رہا۔ اتفاقاً وہ مسافر منہ کھولے ہوئے سوتا تھا۔ وہ حرام خور شریر کوا اس کے منہ میں پیخال کر کے وہاں سے ایک الگ ٹہنی پر جا بیٹھا۔ گرم گرم پیخال جو اس راہ گیر کے منہ میں گری تو چونک پڑا۔ اوپر ہنس کو دیکھ کر غصے سے کہنے لگا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ جلدی سے چلہ کمان پر چڑھا کر ایسا تیر مارا کہ چھاتی سے دو سار پھوٹ گیا۔ پھر توتے نے کہا۔

• اے خداوند ! کمینے کی صحبت خدا کسی بندے کو نصیب نہ کرے کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے ؎

بدوں کے ساتھ تو کم بیٹھ کیونکہ صحبت بد
اگرچہ پاک ہے تو تو بھی وہ پلید کرے
چنانچہ جلوۂ خورشید ہے جہاں کے بیچ
پر ایک ٹکڑا ابر اس کو ناپدید کرے

اور اس بات کو ہر ایک سے کہتا ہوں کہ بد کی صحبت سے اپنے تئیں بچائے رکھے اور سچ ہے کہ بُرے کی رفاقت سے کچھ بھلائی نہیں ہوتی۔"

ہُدہُد نے کہا۔

• اے توتے ! میں تجھے نہیں کہتا کہ تو بگلے کے ساتھ رہ کہ جو حال تیرا اس اس ہنس اور کوے کا ماجرا ہووے۔ تجھ کو بہت دن اس کی صحبت میں رہنا نہ پڑے گا۔ تھوڑے دن کے لیے عرض ہے کہ اس کے ساتھ رہے۔"؟

توتے نے کہا۔

"خداوندا! آپ چند روز کے واسطے کہتے ہیں، وہ صوفی بے چارا ایک شب کی صحبت میں رسوا اور فضیحت ہو گیا۔"
ہُدہُد نے پوچھا کہ اس کا قصّہ کیوں کر ہے؟ تو تے نے کہا۔

نقل ایک کمینے اور صوفی اور اہیرنی کی

سنا ہے کہ ایک کمینہ اصل کہیں راہ میں چلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک صوفی سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہ اے یار! تو کہاں جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ گجرات اور وہاں سے اجین جاؤں گا۔ کہا۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں۔ مجھے بھی وہاں جانا ہے، یہ بولا۔ میرے سر آنکھوں پر۔ انشاء اللہ بخیر و خوبی تجھے منزل مقصود کو پہنچا دوں گا۔ صوفی کچھ راہ خرچ لے کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

جب آفتاب کا گردا مغرب کے تنور میں لگا اور شب نے اپنے چہرے پر تاریکی کی چادر تانی، وے دونوں ایک گاؤں میں جا کر کسی بنیے کی دکان میں اتر پڑے۔ اتنے میں کوئی اہیرنی دہینڈی سر پر لیے ہوئے آنکلی اور ان دونوں سے کہنے لگی کہ میرا گھر یہاں سے پلے پر ہے۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو میں بھی رات کی رات رہ جاؤں؟ وے بولے کہ بہت اچھا، کچھ مضائقہ نہیں، جگہ ڈھیر ہے۔ اپنی دہی کی ہانڈی ہمارے پاس رکھ دے تو ادھر سو رہ یہاں کتے بہت ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا دہی کھا جاویں۔"

اہیرن تو ہانڈی انہیں سونپ کر سو رہی، کمینے آدمی نے آدھی رات کو ہانڈی کا دہی چٹ کیا، اور تھوڑا سا صوفی کے ہاتھ منہ پر لگا کر چپ چاپ سو رہا۔ صبح کو یہ تینوں اٹھے اور اہیرنی نے دیکھا کہ ہانڈی میں دہی نہیں۔ لگی اپنا سر پیٹنے اور دونوں کا منہ دیکھنے، جب خوب دھیان کی تو دیکھا صوفی کا ہاتھ اور منہ دہی سے بھرا ہے۔ کچھ پوچھا نہ گچھا، اٹھتے ہی صوفی کی داڑھی پکڑ کر لگی خوب لتیانے اور غل مچانے کہ تو نے ہی میرا دہی کھایا ہے اور ہانڈی کو پھوڑ اس کا ٹھیکرا گلے میں ڈال دیا اور بازار میں لا کھڑا کیا۔

اگر میں بگلے کے ساتھ جاؤں گا تو میرا بھی ویسا ہی حال ہو گا۔ تب میں بولا۔۔

"اے توتے! کتنی شامیں گزارے گا اور کیا کیا غدر لاوے گا۔ کچھ اندیشہ نہ کر، میرے ساتھ چل میں تیری غلاموں کی طرح خدمت کرتا چلوں گا۔ تو نے آج تک مجھے نہیں پہچانا۔"
توتے نے کہا۔۔۔
"تیری چال منی اور خوبی اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ تو دو بادشاہوں میں تفرقہ کروانا چاہتا ہے۔ اور تو جو مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے، اگر میں تیرے ساتھ چلوں تو میرا حال بھی اس کمہار کا سو ہو گا۔"
میں نے کہا کہ وہ نقل کیوں کر ہے؟
توتا بولا۔۔۔

نقل نروتم کمہار اور اس کی جورو بدکارہ کی

میں نے سنا ہے کہ بداون شہر میں نروتم نامی کمہار رہتا تھا اور جورو اس کی بدکارہ تھی۔ لوگوں سے ہمیشہ لڑا کرتی۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی، آٹھوں پہر سمجھایا کرتے کہ بیٹا! تیری جورو کے لچھن بہت برے ہیں۔ وہ مورکھ ہرگز ان کے کہنے کو باور نہ کرتا۔ اتفاقاً ایک دن اس نے اپنی عورت سے کہا کہ میں تیرے باپ کے گاؤں جاتا ہوں، تین دن میں آؤں گا، تو گھر سے چوکس رہنا ایسا نہ ہو کہ کہیں چور آ پڑیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کر سر جھکا دیا اور رو رو کر کہنے لگی۔

"تم تین روز کے آنے کا اقرار کرتے ہو اور مجھے تمہاری جدائی میں تین روز تین برس کے برابر ہیں۔"

اس کو روتا دیکھ کر وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور عاجزی سے کہنے لگا۔ کہ مجھ کو اپنے پاس ہی جانیو۔ میں جب تک تجھ کو نہ دیکھوں گا۔ دانا پانی مجھ پر خوش نہ آوے گا۔ یوں اسے سمجھا بجھا کر چلا گیا۔ کوس چار پر جا کر یہ خیال اس نے اپنے جی میں کیا کہ کمہاری کو میں روتا چھوڑ آیا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے تئیں جدائی کے خنجر سے جوہر کرے۔ اور دل میں کہنے لگا کہ خدا جانے یہاں سے گھر پہنچنے تک میں اسے جیتا پاؤں یا نہ پاؤں، یہ سوچتے ہی اپنے پاؤں پھرا۔ اس کی جورو نے کیا کیا کہ جب وہ گھر سے نکلا، دن دوپہر ہی ایک کٹے مسٹنڈے کو کہیں سے لائی اور اپنی کوٹھڑی میں لے جا کر عیش کرنے لگی۔ پھر ایک رات رہے وہ کمہار پھر آیا۔ کواڑ کے پٹ بھڑے دیکھ کر جانا کہ کوئی غیر مرد اس کے گھر میں ہے اور اس کی آہٹ بھی پائی۔ یہ سمجھ کر وہ آہستے آہستے گھر کی ٹٹی کے نیچے سے ہو کر کسی پلنگ کے تلے گھس گیا۔ کمہاری نے بھی پاؤں کے کھٹکے سے جانا کہ میرا خاوند چارپائی کے نیچے آ کر دبک رہا ہے۔

وہ اپنے یار سے پکار پکار کر کہنے لگی۔

"اے مرد! تو نے کہا تھا کہ میں ایماندار ہوں، ایسا نہ ہو کہ اب بے ایمان ہو جاوے اور تو جانتا ہے کہ تیرے ساتھ جو میں نے شرط کی ہے۔"

یار نے بھی اس کے اشارے سے معلوم کیا کہ اس بات میں کچھ فی ہے اور اس چارپائی کے نیچے کچھ نہ کچھ ہے، تو چپکا ہو رہا، دیکھو تو یہ عورت کیا کرتی ہے؟ پھر وہ بولی کہ میں نے تجھ کو کہا تھا کہ میرا خاوند گھر میں نہیں ہے۔ تو دو تین دن میری غریبی کی نگہبانی کر اور تو نے کہا تھا کہ تو مجھ کو کیا دے گی؟ میں نے کہا تھا کہ اپنے خاوند کے باغ سے ایک گلدستہ خوشبودار پھولوں کا بنا کر تجھ کو دوں گی۔ لیکن پھر اسی وقت میں نے اس اقرار کا انکار کیا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تو کچھ پیسا ٹکا مانگے گا تو ایک دمڑی نہ پاوے گا۔ پھر تو نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں چاہتا، بھلا کسی وقت رات کو اپنی پائنتی لیٹ رہنے دینا، میں نے اس شرط پر قبول کیا تھا کہ میرے خاوند کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاوے۔ شہدا بولا۔

"اے نیک بخت! میں ایسا دغاباز بے ایمان نہیں ہوں کہ پرائی چیز پر ہاتھ ڈالوں اور جس بات کا ٹھکانا نہیں، اس کے ایمان کا بھی ٹھیک نہیں جیسا تجھے اپنے خاوند کا ڈر ہے، مجھے خدا کا خوف ہے۔ میں نے اس عمر میں بہت سیر کی ہے پر تجھ سی عورت ستونتی اور دیانت دار کہیں نہیں دیکھی۔ اسی عصمت و پارسائی کے سبب سے تیرا خاوند تجھے چاہتا ہے۔"

رنڈی نے کہا۔

"تو جو اتنی تعریف میرے صلاح و تقوے کی کرتا ہے۔ میں کس لائق ہوں، پر شب و روز خدا کی درگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ سوائے اپنے خاوند کے کسی غیر مرد کا منہ نہ دیکھوں۔"

اتنے میں چھپر کھٹ کا ایک پایا ٹوٹ گیا۔ کمہار نے جلدی اپنے ہاتھ کے آسرے سے تھام لیا گرنے نہ دیا۔ تمام شب وہ سہارا دیے بیٹھا رہا۔ جب صبح ہوئی، گھر والے نے چھپر کھٹ کے نیچے سے نکل کر اس جوان کو گلے لگا لیا اور کہا۔

"اے یارِ باصد رحمت تجھ کو تیرے ماں باپ کو کہ جیسی تو نے میرے مال کی اور گھر بار کی حفاظت کی ویسا ہی خدا تیرے ایمان کا نگاہبان رہے۔ میں نے تجھ سا صالح اور پرہیزگار کہیں نہیں دیکھا۔ شاید کہ جہان تیرے ہی قدم سے قائم ہے۔"

یہ کہہ کر کچھ روپے بطریقِ نذر اس کو دیئے اور رخصت کیا۔ پھر اپنی جورو کے لگا پاؤں پڑنے اور اس کی عصمت پر آفرین کرنے اور دعائیں دینے اور کہنے کہ جیسی تو نے میری داڑھی کی شرم رکھی، خدا تجھے ویسی ہی جزا دے۔ عورت بولی کہ شکر ہے خدا کی درگاہ میں۔ جواب تک تیری فرمانبرداری میں مجھ سے قصور نہیں ہوا۔ اور شب و روز یہی چاہتی ہوں کہ خدا تیرے سامنے مجھ کو زمین کا پیوند کرے کہ اسی سے میری دونوں جہانوں میں سرخ روئی ہے۔

یہ قصہ تمام کر کے توتے نے مجھ سے کہا کہ جیسا کہ وہ کمہار احمق اپنی عورت کی بدکاری آنکھوں سے دیکھ کر اس کے مکر و فریب میں آگیا، میں ویسا بے وقوف نہیں جو تیری میٹھی باتوں پر بھول جاؤں اور جہاں تو لے جاوے چلا جاؤں۔ میں نے کہا۔ وہ کمہار نہایت دانا تھا۔ اگر تجھ سا نادان ہوتا تو اپنی عورت کا بھید ظاہر کرتا۔ تو رنڈی سمیت اپنے ہم چشموں میں رسوا ہوتا اور وے دونوں عمر بھر ساری خلقت کے انگشت نما رہتے۔ اگر وہ برداشت نہ کرتا تو غصے سے کسی کو مارتا یا آپ مر رہتا۔

توتا بولا۔۔۔

"تو مجھ سے کہتا ہے کہ اگر وہ تجھ سا ہوتا تو وہیں خون خرابہ کرتا۔ شکر خدا کا کر مجھے حق تعالیٰ نے آج تک ہر ایک بری بات سے بچا رکھا ہے اور اب تک ایک خون بھی میرے ہاتھ سے نہیں ہوا۔ اور تو اتنے خون ناحق روز کرتا ہے کہ میری عقل میں نہیں آتے، بھلا یہ تو کہہ خدا کو کیا منہ دکھاوے گا اور کون سی دلیل اپنے بچانے کے لیے لاوے گا۔"

میں نے کہا۔۔۔

"تو نہیں دیکھتا، میں پانی میں جب پاؤں رکھتا ہوں تو کیسا ہولے ہولے چلتا ہوں کہ مبادا میرے پاؤں تلے کوئی جی آوے۔"

توتا بولا۔

"اے دغاباز! تیرا ہولے چلنا فریب سے خالی نہیں، پانی میں تو یوں آہستے آہستے چلتا ہے کہ کسی کو صدمہ نہ پہنچے لیکن جیتی مچھلیوں کو بے تامل نگل جاتا ہے۔"

جب ہُدہُد نے دیکھا کہ دونوں کی تقریر میں سراسر خلاف ہے اور توجیہ دونوں کی درست ہے، تب خان سامان کو فرمایا کہ بگلے کے واسطے سات پارچے کا خلعت جلد لاؤ۔ میر سامان نے جلدی سے چوگوشے میں لگا حضور میں لا حاضر کیا۔ بادشاہ نے مجھے خلعت دے اور خاطرداری کر رخصت کیا اور کہا۔

"تو آگے چل میں تیرے پیچھے توتے کو بھی قاز کے پاس بھیجتا ہوں۔"

میں دو تین روز کے درمیان حضور میں آ کر حاضر ہوا۔ پھر کھڑے ہو کر ادب سے کہنے لگا۔

"پیر و مرشد! آپ غافل کیوں بیٹھے ہیں۔ لڑائی کی تیاری کیجیے۔ ہُدہُد جنگ کے ارادے پر فوج لیے آتا ہے، کوئی دن کو یہاں پہنچے گا۔"

یہ بات سن کر قاز اور اس کے وزیر سرخاب نے ہنس دیا اور بگلے سے بطور رمز کے کہنے لگا۔ کیا خوب! تو اتنی مدت کے سفر میں یہ تحفہ لایا؟ بگلے نے عرض کی۔ جہاں پناہ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ جو باتیں سچی اور خیر خواہی کی تھیں، سو میں نے خدمت میں گزارش کیں۔ آگے جو مرضی خداوندی کی ہو سو بہتر۔ بادشاہ نے بگلے سے کہا کہ جتنے تمہارے بھائی بند ہیں سبھوں کو جمع کر کے ہمارے پاس لاؤ، ہم ان کو نوکر رکھیں گے۔

یہ بات سن کر بگلا بہت خوش ہوا، اور قاز سے رخصت لے کر گھر آیا اور اپنے سب بھائیوں کو اور برادری کے لوگوں کو جمع کرنے لگا۔ تب سرخاب نے قاز سے عرض کی کہ خداوندا! ایسے بدباطن فریبی کو سرکار میں دخیل کرنا مناسب نہیں ہے قاز نے سرخاب کی بات کا جواب نہ دیا اور یہ کہا۔

"ایسا ماجرا ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی نہیں سنا تھا۔ سو اس کی زبانی سنا شاید یہ بات سچ ہو۔ اب تو ایسی فکر کر دشمن غالب نہ ہو سکے۔"

سرخاب نے کہا کہ جہاں پناہ! اس مشورے کے لیے خلوت ضرور ہے۔ کیونکہ اگر کوئی صلاح داناؤں کی مجلس میں کرے، گو کہ آواز اس کی ان کے کان تک نہ پہنچے تو بھی وے اس کے ہونٹوں کی حرکات اور ہاتھوں کے ہلنے اور سر کی جنبش سے صاف معلوم کر جاتے ہیں۔ پس ایسی جگہ چاہیے کہ جہاں کوئی نہ دیکھے اور وہاں کے بیٹھنے کی کسی پر اطلاع بھی نہ ہو۔ مثل ہے کہ دیوار ہم گوش دارد۔

آخرش بادشاہ اور وزیر دونوں خلوت میں گئے۔ تب سرخاب کہنے لگا کہ میرے خیال میں یہ آتا ہے کہ بگلے کو ہُدہُد کے یہاں صلح کے لیے بھیجئے۔ لڑائی خوب نہیں کیوں کہ جنگ دو سر دارد۔ خدا جانے فتح کس کی ہو۔ قاز نے یہ اس کی مصلحت پسند نہ کی۔ تب عرض کی کہ اول دو چار حق سندوں کو ہُدہُد کے ملک میں جاسوسی کے لیے روانہ کیجیے تاکہ اس کے لشکر کی تعداد اور روز روز کا حال دریافت کر کے حضور میں بطور خفیہ نویسی کے پہنچایا کریں۔ کیوں کہ بادشاہ کو لازم ہے کہ جب کوئی لشکر لاحق ہو تو اس کا جلد تدارک کرے اور ہرگز اس سے غافل نہ رہے اور جاسوسوں کے عیال و اطفال کو بخوبی نظربند رکھے کہ وے اس ملک کے لوگوں سے مل نہ جاویں۔ اور اپنے لڑکے بالوں کو مفت بھی نہ لے جا سکیں اور تم سے بغاوت نہ کریں۔۔۔

قاز نے کہا۔ تیری دانست میں لائق جاسوسی کے کون ہے؟ سرخاب بولا۔ کہ پیلک۔ لیکن پہلے اس سے حلف اور قسم لے لیجیے کہ یہ بات کہ جس واسطے ہم تمہیں وہاں بھیجتے ہیں، کسو سے نہ کہیے۔ اگر وہ بات کسو پر کھلے گی تو بڑی سزا تم کو دی جاوے گی۔ کیوں کہ افشائے راز میں بڑی قباحتیں ہیں۔ تمام ملک میں فساد برپا ہوگا۔ اور کام بھی خاطر خواہ انجام نہ پاوے گا۔ بات بگڑ جاوے گی۔ پھر اس کا سنوارنا بہت مشکل ہوگا۔

تب قاز نے پیلک کو بلایا اور جس طرح سے کہ سرخاب نے کہا تھا۔ اسے قسم کھلا حلف لے۔ خلعت اور پان دے جاسوسی کے لیے بھجوایا، اور زبانی بھی فرمایا کہ میں دیکھوں تو کیسی خیر خواہی سرکار کی کرتا ہے۔ بعد دو تین روز کے کلنگ کوتوال نے بادشاہ کے سامنے آ کر عرض کی جہاں پناہ! ہُدہُد جو خشکی کا بادشاہ ہے اس کی طرف سے ایلچی ہو کر ایک توتا آیا ہے اور اس کے ساتھ دو چار رفیق بھی ہیں۔ سو ڈیوڑھی پر حاضر ہیں۔ اگر حکم ہو تو روبرو لاویں۔ یہ سن کر قاز نے سرخاب کی طرف دیکھا۔ اس نے عرض کی کہ بالفعل حکم کیجیے۔ جہاں بہت لونا پانی اور ہوا زبون ہو، وہاں اس

ے رہنے کو جگہ مقرر کریں، ہو تو تا چند روز اپنے رفیقوں کے ساتھ وہاں رہ کر معلوم کرے کہ یہ جگہ اچھی نہیں، پانی یہاں لگتا ہے، ہوا بری ہے۔ جو کوئی یہاں رہتا ہے سو اذیت پاتا ہے۔ تب یہ احوال اپنے بادشاہ کو لکھ کر بھیجے گا کہ اس شہر کی آب و ہوا نہایت مخالف ہے۔ جو کوئی یہاں آوے گا، سو اپنی جان جاوے گا۔ اس خوف سے یقین ہے ہُدہُد ادھر کا قصد نہ کرے گا۔ اور یہ بھی گھبرا کر خود بخود رخصت ہو جاوے گا۔

قاز نے بھی اس کے کہنے سے ایسی جگہ مقرر کی۔ جو کوئی وہاں پانی کی ایک بوند بھی پیے اور اس کی جگہ کی ہوا کھاوے تو مفت اپنی بھلی چنگی جان گنوا دے پھر قاز نے فرمایا۔

”تو جو کہتا ہے کہ لڑنا خوب نہیں، صلح بہتر ہے کیونکہ اس میں ایک فکر اور اس میں ہزار اندیشے ہیں اور انجام اس کا معلوم نہیں کیا ہو! یہ بات غلط ہے۔ کس لیے کہ میرے پاس فوج بہت ہے، خزانہ بے شمار ہے خدا کے فضل سے مجھے یقین ہے کہ میری فتح ہوگی تو صلح کی بات ہرگز ہرگز زبان سے مت نکال بلکہ خدا سے یہ دعا مانگ کہ میری فتح ہو؟“

سرخاب بولا۔

”پیر و مرشد! یہ لازم نہیں کہ بہت فوج اور خزانہ ہونے سے فتح ہو، اگر خداوند سے کسی نے اس بارے میں ترغیب سے کہا ہو، محض غلط ہے کیوں کہ آپ کے لشکر کے لوگوں نے لڑائی کا منہ اور جنگ کا میدان نہیں دیکھا اس لیے لڑائی کے نام سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ جب کہ دشمن کی فوج کے سامنے ہوں گے، تب دیکھو کہ ان کے پیر ٹھہرتے ہیں کہ نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ مخالف کو دیکھتے ہی بھاگیں گے بلکہ روکے سے بھی نہیں رکیں گے، کیونکہ آج تک انہوں نے لڑائی بھڑائی نہیں دیکھی اور اپنے اپنے گھروں میں فراغت سے رہا کیے ہیں۔ اور آرام طلب ہو رہے ہیں۔ اس واسطے میں منع کرتا ہوں کہ آپ ہرگز ہرگز لڑائی کا قصہ نہ کیجیے اور صلح کرنی بہت خوب ہے۔ اور بہت ایسے ہیں کہ گھر میں لاف زنی کیا کرتے ہیں، وقت پر کام نہیں آتے اور لڑائی کے میدان سے جلد بھاگتے ہیں۔ اگر تم کو لڑائی ہی کا ارادہ ہے تو جنہوں نے لڑائیاں دیکھی ہیں ان کو سردار کیا چاہیے، نہ ان کو جو ڈرے ہوئے ہوں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ڈرنے والے نہیں لڑا کرتے گرنا جاری ہے۔ جو لوگ آزمودہ کار اور جنگ دیدہ ہیں ان کو سالار فوج کیا چاہیے اور مجھے بگلے کے کلام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہُدہُد آج کل مع فوج تمہارے ملک میں لڑائی کے لیے پہنچتا ہے۔ بالفعل صلاح وقت یہی ہے کہ کچھ تدبیر اس کی ابھی سے ہو رہے۔ اس وقت کچھ نہ ہو سکے گی۔ اس میں غفلت نہ کیجیے۔ کہتے ہیں کہ دشمن جب تک دور ہے اس سے احتراز کیا چاہیے، جب نزدیک آ پہنچے تو جنگ کرنا ضروری ہے اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہُدہُد کی فوج آپ کے لشکر سے بہت ہے۔ کچھ ایسی فکر ہو جس سے یہ ملک ہمارے قبضے میں رہے اور اس کا کچھ اندیشہ نہ کیا چاہیے، کس واسطے کہ فتح خداداد ہے۔“

قاز نے کہا۔

”اس کو بھی تم سوچو کہ کس حکمت سے شہر ہمارا سلامت رہے۔“

اس نے عرض کی۔

”یہ تو تاجر ایلچی ہو کر آیا ہے، اب اس کو اذیت میں رکھنا مناسب نہیں، بلکہ حضور میں بلا کر ایسی میٹھی باتیں کیجیے کہ وہ خوش رہے اور مکان بھی اس کے واسطے اچھا سا تجویز کیجیے کہ کسی طرح سے تکلیف نہ پاوے۔ پھر دانائوں کی صلاح سے ایک کوٹ بنوائیے۔“

قاز نے پوچھا۔

”کوٹ بنوانے میں تو کیا فائدہ سمجھتا ہے؟“

کہنے لگا۔

”قلعہ سرداروں کو ضرور ہے کیوں کہ برے وقت میں اگر کوئی سو یا دو یا پانچ سوار اپنے قلعے میں رہے اور دس ہزار سوار دشمن کے اس کو محاصرہ کر لیویں تو چند روز اس کو کچھ اندیشہ نہیں اس عرصے میں کچھ نہ کچھ صورت رفاقت کی ہو جاتی ہے۔ اگر مخالف کی سپاہ پلٹ جاوے اور کوئی آ کر یہ بات کہے کہ دشمن کی فوج بھاگی جاتی ہے۔ ہرگز اس کے کہنے سے اس کا پیچھا نہ کیجیے۔ اس میں اکثر لوگوں نے دغا کھائی ہے اور عقل مندوں نے کہا ہے کہ جس کا لشکر بہت نہ ہو اس کو چاہیے کہ شہر پناہ میں رہے اور اگر شہر پناہ نہ ہو تو بنا لیوے اور دیواریں اس کی بہت بلند ہوں اور خندق گہری اور چوڑی ہو۔ اور ہتھیار جتنے چاہیں اس میں موجود رہیں۔ اور دانے پانی کا بھی ذخیرہ موجود رہے۔ جب ایسا بندوبست آگے سے ہو رہے تو یک بیک کسی حریف کا قدم نہیں پڑ سکتا۔“

قاز نے سرخاب سے کہا کہ اس کام کے واسطے میں کس کو مقرر کروں کہ جس سے یہ کام انجام ہو۔ سرخاب بولا۔

”اگر شتابی کام کرنا منظور ہو تو ایسے کو کہیے کہ جس پر اپنا اعتماد ہو۔ سو ایسا شخص اس سرکار میں سوائے کلنگ کوتوال کے دوسرا مجھے نظر نہیں آتا۔“

تب اس کو اسی وقت بلایا اور وہ حضور میں حاضر ہوا۔ اس کے حق میں بہت سی سرفرازی کر کے فرمایا کہ اے کلنگ! سرخاب کے کہنے کے موافق جلد ایک بڑا سا مضبوط قلعہ تیار کر۔ اس نے آداب بجا لا کر عرض کی۔

”جہاں پناہ غلام نے اس سے چند روز آگے ہی کوٹ تیار کر رکھا ہے اور ذخیرہ غلے کا اور اسباب لڑائی کا جتنا کچھ چاہیے، سب اس میں موجود کر رکھا ہے!“

یہ سن کر قاز بہت خوش ہوا۔ بعد کتنے دنوں کے بگھوبرن نام کوا اپنی برادری سمیت حاضر ہوا اور کہا کہ سنگل دیپ سے چل کر نوکری کے لیے آیا ہوں۔ قاز اسے نوکر رکھنے لگا تو سرخاب نے اسے کہا۔ مبادا یہ کوا بھیجا ہوا کہیں بادشاہ ہُدہُد کا ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ بڑی خرابی کرے گا، اگر اس کو آپ نوکر رکھیں گے۔

چوتھا باب

نقل دو قازوں اور کچھوے اور مچھوے کی

سرخاب نے کہا۔ جالندھر کے دیس میں پدم نام ایک ندی ہے۔ دو قاز وہاں بہ کمال سے رہتے تھے۔ اور ایک کچھوا بھی اسی ندی میں رہتا تھا وہ اس سے قازوں سے بڑی دوستی تھی۔ چاند نام ایک مچھوا اس کے کنارے یوں کہتا چلا جاتا تھا کہ کل اس میں

جال ڈال کے سب مچھلیاں پکڑوں گا۔ لچھے کی بات کچھوا اور دونوں قاز سن کر ... بہت ڈرے اور آپس میں صلاح کرنے لگے کہ اب کیا کیا چاہیئے کہ اس کے ہاتھوں سے کس طرح جی بچے۔ قاز بولے کہ آج دن بھر دیکھ لو کہ ماہی گیر سچ بول گیا ہے کہ جھوٹ۔ کچھوا بولا۔ سنو یارو! اپنے کہے پر اگر وہ کل یہاں آن پہنچا۔ تم تو پرند ہو اُڑ جاؤ گے اور میں اپنے میں اتنی طاقت نہیں دیکھتا جو اس کے ہاتھوں سے بچوں جیسا کہ بنیئے کی جورو نے اپنے تئیں اور غلام کو مکر سے بچایا۔

قازوں نے پوچھا کہ وہ قصہ کیوں کر ہے۔

نقل ایک کچھوے اور بنیائن اور غلام کی

کچھوا بولا۔ کہ ایک کچھوے کو کوئی شکاری پکڑے لیے جاتا تھا۔ کسی بنیئے کے لڑکے نے اپنے کھیلنے کے لیے اسے مول لے لیا۔ دن کو اس کے ساتھ کھیلا کرتا۔ اور رات کو اس کی ماں اسے پانی کے گھڑے میں بند کر دیتی۔ اسی طرح جب کچھ دن گزرے ایک روز کیا ہوا کہ بنیئے کی عورت اپنے غلام کا منہ چوسنے لگی۔

اتفاقاً بنیا اس روز بے وقت دکان سے اپنے گھر میں آنکلا اور نظر بنیئے کی بنیائن پر جا پڑی۔ وہ سمجھی کہ میرا بھید اب اس پر کھل گیا۔ جلدی سے خاوند کے پاس دوڑی آئی اور غصے سے کہنے لگی کہ اس موئے غلام نے چھ ماشے کافور جو گھر میں رکھا ہوا تھا۔ سو چرا کر سب کھا لیا۔ اس کے منہ سے بو آتی ہے۔ غلام رو کر کہنے لگا کہ مہاراج! اگر میں نے کھایا ہو تو مہا پاپی ہوں۔ پر یہ رنڈی جھوٹ موٹ مجھے دوکھ لگاتی ہے۔ جس گھر میں ایسی جھوٹی استری ہو، اس میں کوئی غریب کیوں کر رہنے پائے گا۔ تب بنیئے نے بھی غلام کا منہ سونگھا پر اس کی بو باس نہ پائی۔ تب جھنجلا کر عورت سے کہنے لگا کہ تو نے سارا کافور اپنے پتا کے گھر بھجوا دیا اور غلام کو طوفان لگایا۔ وہ یہ سنتے ہی چڑچڑا اٹھی۔ وہ گھڑا کہ جس میں کچھوا تھا۔ دریا کی طرف سر پر رکھ کر لے چلی۔ اس مہاجن نے دل میں سوچا کہ غصے کے مارے ندی میں ڈوبنے نہ چلی ہو اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی لپکا۔ ندی کے کنارے پہنچتے پہنچتے جا لیا اور اس کے ہاتھ پاؤں پڑ کر منانے لگا کہ مجھ سے چوک ہوئی۔ جانے دے اور اسے کھینچ کر گھر کی طرف لانے لگا۔ وہ غصے سے ہاتھ جھٹک کر اپنے تئیں چھڑانے لگی۔ اس کھینچا کھینچی میں سر پر سے گھڑا گر کر پھوٹ گیا اور کچھوا پانی میں چھوٹ گیا۔

یارو! اگر آج اتنی یاری کرو کہ مجھے یہاں سے کسی اور ندی میں لے پہنچاؤ تو میں بچتا ہوں۔

قازوں نے کہا۔ تیرا جانا خشکی میں اچھا نہیں۔ کچھوا بولا اگر تم مجھ کو نہ لے جاؤ گے تو میں اپنے پاؤں سے جاؤں گا۔

یہ سن کر قاز فکر مند ہوئے۔ اور کہا تمہاری حالت اس بگلے کی سی ہو گی۔ کچھوے نے پوچھا وہ قصہ کیوں کر ہے۔

نقل ایک سانپ اور بگلے کی

قاز بولے۔ کہ جاگ رتی ندی کے کنارے پر ایک درخت تھا۔ اور اس کے نیچے کسی جانور کا ایک بل تھا۔ اس میں ایک سانپ رہتا تھا۔ ہر روز سوراخ سے نکل کر وہاں پھرا کرتا۔ جو کچھ کھانے کی چیز پاتا سو کھا لیتا۔ اس درخت کے رہنے والوں کو اذیت نہ دیتا۔ اس میں ایک بگلے نے اس پر گھونسلا بنا کر بچے دیئے پر اسے اندیشہ ہوا کہ کسی دن یہ سانپ ہمارے بچوں کو کھا جائے گا۔ ایسی تدبیر کیا چاہیئے کہ کسی طرح یہ مارا جاوے۔ اور بچے ہمارے محفوظ رہیں۔ ایک بگلا جو ان میں بڈھا بڑا تھا، سو بولا کہ یارو! ایک نیولا آج میں نے اسی درخت کے نیچے پھرتے دیکھا ہے۔ تم ایک کام کرو کہ ندی سے اپنے اپنے منہ میں ایک ایک مچھلی پکڑ لاؤ، اور اسی درخت کے تلے ڈال دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نیولا ان کے کھانے کے لیے آوے گا اور سانپ بھی اپنے سوراخ سے نکلے گا۔ ان دونوں کی آپس میں عداوت قلبی ہے۔ دونوں لڑیں گے۔ اغلب کہ سانپ نیولے کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔

بگلوں نے موافق اس کی صلاح کے ندی سے مچھلیاں نکال کر درخت کے نیچے ڈال دیں اور آپ اس کی ٹہنیوں پر چپکے ہو بیٹھ رہے۔ اس انتظار میں کہ ان دونوں میں لڑائی ہو اور ہم تماشہ دیکھیں۔ کہ کون کس کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے؟

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ نیولا کہیں سے آنکلا اور مچھلیوں کو چُن چُن کر کھانے لگا۔ سانپ بھی مچھلیوں کی طمع سے نکلا پر نیولے کو دیکھ کر ایک جھاڑی تلے دبک رہا۔ اس ارادے سے کہ نیولا سرکے تو میں ان میں سے لوں۔

اتفاقاً نیولے کی نظر اس پر جا پڑی اور وہیں جھپٹا۔ دونوں کی لڑائی ہونے لگی آخرش نیولے نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ پھر سر اٹھا کر جو اوپر دیکھا تو سفید بگلے چمکتے نظر آئے۔ جانا کہ اس درخت پر بھی مچھلیاں ہیں۔ اوپر چڑھ گیا۔ بگلے تو اڑ گئے۔ گھونسلوں میں جو بچے تھے انہیں چٹ کر گیا اور گھونسلے ان کے اجاڑ دیئے۔

قاز بولے۔ اے یار! مروّت ہے کہ پہلے اپنے واسطے جگہ نئی ٹھہرا لے۔ تب اپنے قدیم گھر کو چھوڑے۔ یہ لب پاس تیرا سب جگہ سے بہتر ہے۔ کچھوے نے جواب دیا۔ دوستو! تم ہمیشہ اس راہ سے آتے جاتے ہو کبھی مجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی۔ ناحق مجھ کو کیوں ڈراتے ہو؟ قازوں نے بہت سمجھایا۔ لیکن اس نے ان کی نصیحت نہ مانی۔ تب انہوں نے لاچار ہو کر کہا۔ لے تو اب ایک کام کر اس لکڑی کو بیچ میں سے منہ میں پکڑ۔ اگر کوئی تجھے گالی بھی دیوے۔ تو ہرگز نہ بولیو۔ اس نے کہا۔ گالی کیا، جو مجھے مارے گا تو بھی دم نہ ماروں گا۔ اس قول و قرار پر اس لکڑی کے سرے دونوں قاز منہ سے پکڑ کر لے اڑے۔ جب ایک گاؤں کے برابر پہنچے تب وہاں کے لوگ دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک لڑکا بولا۔ کہ اگر یہ کچھوا گرتا اور میرے ہاتھ آتا۔ تو اسے بھون کھاتا۔ دوسرے نے کہا۔ جو میں اسے پاؤں تو پکا کھاؤں۔ کچھوے کو ان باتوں کی برداشت نہ ہوئی۔ نہایت خفگی سے بولا خاک کھاؤ۔ بولنے کے ساتھ ہی زمین پر آ رہا۔ لڑکوں نے دوڑ کر پکڑ لیا اور بہت فضیحت کی۔

پھر سرخاب نے کہا۔ اے بادشاہ! جو کوئی اپنے رفیق کا کہا نہ سنے۔ تو اس کے آگے ایسا دن آتا ہے۔ اسی بات چیت میں تھے۔ جو کلنگ کے بھائی نے آ کر سلام کیا اور کہا۔ غلام نے آگے کہلا بھیجا تھا۔ کہ قلعے کے اندر کوا ہُدہُد کا بھیجا ہوا ہے اور اس نے اس کو خلعت دیا ہے۔ اور جو ملک لیا سو اس کے لڑکوں کے نام مقرر کیا۔ لیکن کرگس وزیر اس کا اس بات سے راضی نہ ہوا۔ بلکہ اس نے عرض کی کہ حضرت! یہ ملک کوّے کو نہ دیا چاہیئے۔ کیونکہ میں اسے بے وفا جانتا ہوں۔ ہُدہُد نے جواب دیا جو نوکر نمک حلالی کرے۔ اس کے حق میں مہربانی کرنا ضرور ہے۔ کہ پھر دوسرے وقت خاوند (خداوند) کا کام دل و جان سے کرے۔ کرگس نے کہا۔ حضرت! کوا کم ذات بد آئین ہے۔ جو کوئی اس کے حق میں نیکی کرے گا۔ وہ دیکھے گا۔ جو بوڑھے جوگی نے دیکھا۔ ہُدہُد نے پوچھا کہ وہ نقل کیوں کر

ہے ؟ کرگس نے کہا۔

نقل ایک جوگی اور چوہے کے بچے کی

یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ کنارے پر دریا سندھ کے ایک جوگی کا دھرا تھا۔ ایک روز وہ اس کے دروازے پر بیٹھا جپ کرتا تھا کہ ایک کوا چوہے کا بچہ اپنے چنگل میں لیے اڑا جاتا تھا۔ قضا کار وہ اس کے پنجوں سے کسی طرح چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے اسے از راہِ شفقت زمین سے اٹھایا۔ اور کوے کے چنگل سے چھڑایا اور اس کا جی بچایا اور ایسی الفت سے پالا پوسا کہ وہ بڑا ہوا۔

ایک روز کہیں اس پر بلی جھپٹی۔ جوگی نے کسی طرح بہ ہزار خرابی اس کے مُنہ سے بھی بچایا۔ پھر اپنے دل میں یہ ٹھانا کہ اس چوہے کو بلی بنایا چاہیے تاکہ اور بلیوں سے بچے۔ دعا کرتے ہی ترت چوہے سے بلی ہو گئی اور کتوں سے ڈرنے لگی۔ تب فقیر نے اسے کتا بنایا۔ پھر اس کے جی میں یوں آیا کہ اسے شیر بناؤں کہ ہر ایک درندگی گزند سے محفوظ رہے۔ آخر اس کی دعا سے وہ شیر ہوا۔ دن کو وہ جنگل میں شکار کے لیے نکل جاتا۔ رات کو آکر جوگی کی چوکی دیا کرتا۔ جو لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے سو آپس میں یوں چرچا کرتے کہ پہلے یہ چوہا تھا فقیر کی دعا سے بلی ہوا۔ پھر کتا ہوا تس پیچھے باگھ بنا۔ اس نے یہ بات سن کر دل میں اپنے فکر کیا۔ کہ جیسا میں پہلے تھا ویسا ہی یہ جوگی جو مجھے بنا ڈالے تو میں اس کا کیا کر سکوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ اُسے مار ڈالوں تو سب آفتوں سے بچا رہوں۔ یہی خیال خاطر میں لا کر وہیں جوگی کو مار کر اس کا لہو پیا اور اپنے بدن پر بھی لگایا۔

پھر کرگس نے ہُدہُد سے کہا۔ اگر یہ ملک تم کوے کو دو گے۔ تو تمہاری حالت جوگی کی سی ہوگی۔ ہُدہُد نے اُسے جواب دیا۔ جو میں اس ملک کا لالچ کروں تو میرا احوال بھی اس بگلے کا سا ہوگا۔ کرگس نے پوچھا کہ حضرت وہ قصہ کیوں کر ہے ؟

نقل ایک بوڑھے بگلے اور مچھلیوں کی

ہُدہُد کہنے لگا کہ ہندوستان میں ایک بڑی جھیل ہے۔ نام اس کا گومتی۔ لیکن گرمی کے ایام میں اس میں پانی کم رہتا ہے۔

ایک دن اس کے کنارے پر ایک ایسا بوڑھا بگلا جو اتنی طاقت اس میں نہ تھی کہ دوسری جھیل میں جا سکے۔ آیا۔ کہ ماتم زدوں کی طرح فریب سے صورت بنا کے سر زانو کے پردوں میں ڈال بیٹھا۔ ایک کینکڑے نے اسے اس طرح سے بیٹھا دیکھ کر پوچھا کہ آج میں تمہیں بہت مغموم دیکھتا ہوں۔ اس کا کیا سبب ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے کل اپنے دوست سے یوں سنا ہے۔ کہ کل اس جھیل کی ساری مچھلیاں جھینگے مارے جائیں گے۔ میں اسی ششش و پنج میں بیٹھا ہوں کہ میرا حال کیا ہوگا۔ کیونکہ اس جھیل کی مچھلیوں پہ میری روزی موقوف ہے۔ ان کے مارے جانے پر مجھے غذا کہاں سے ملے گی۔ اور میں اپنی باقی عمر کیوں کر کاٹوں گا۔

کینکڑے نے یہ سُن کر ان مچھلیوں کو جا خبر کی۔ وے سنتے ہی گھبرا کر سب کی سب رونے لگیں اور اسی کے ہاتھ یہ پیغام بگلے کو کہلا بھیجا۔ کہ شکاریوں کے ہاتھ سے ہمارے بچنے کی کیا تدبیر کی ہے ؟ بگلا بولا۔ کہ میری دانست میں نیک صلاح یہ ہے کہ تم ایک ایک مچھلی کو لا کر مجھے سپرد کرو۔ میں اسے اپنی چونچ میں لے کر دوسری جھیل میں (جو یہاں سے کوس دو ایک پر ہوگی اور پانی بھی اس میں ہے) چھوڑ آؤں گا۔ اس نے اس کی صلاح کے موافق کیا۔ جتنی مچھلیاں اس میں تھیں۔ ایک ایک کر کے سب کی سب اُسے پہنچائیں۔ وہ انہیں ایک ایک کر اس حکمت سے کسو گوشے میں لے جاتا اور کھا آتا۔ کینکڑا اکیلا رہ گیا تب اس نے بگلے سے کہا آپ نے بڑی محنت اور ثواب کا کام کیا۔ اس کا اجر خدا سے پاؤ گے۔ پھر بگلے نے کہا۔ اب میرا جی یہ چاہتا ہے کہ جہاں میں نے سب مچھلیوں کو پہنچایا ہے وہاں تم کو بھی لے پہنچاؤں۔ تب میری خاطر جمع ہو۔ وہ بولا کہ آپ کی تصدیع ہوگی۔ میں اپنے پاؤں جاؤں گا کیوں کہ میرے پاؤں میں آہستے آہستے کوس آدھ کوس چلنے کی طاقت ہے۔ یہ بولا۔ یارا میں جانتا ہوں کہ پاؤں چلنے سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ اور تمہاری اذیت میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔ بہتر یہ ہے۔ کہ تم میری پیٹھ پر چڑھ بیٹھو۔ تو میں تم کو اس بلائے ناگہانی سے بچاؤں۔ الغرض وہ بعد اس رد و بدل کے راضی ہوا۔ تب اس نے پیٹھ پر بٹھا کر وہاں لا اُتارا جہاں مچھلیوں کو کھایا کرتا تھا۔ کینکڑے نے جو دیکھا کہ سوائے خشکی وہاں پانی کا نام و نشان نہیں۔ مگر مچھلیوں کے سروں کی ہڈیاں پڑی ہوئیں وہاں دکھائی دیں۔ دل میں ڈر کر بگلے سے کہا کہ تُو نے سب مچھلیاں یہاں لا کر کھائی ہیں۔ اب کیا مجھے بھی کھایا چاہتا ہے ؟ اس بات کے ساتھ ہی اچھل کر بگلے کا سر اپنے منہ میں پکڑ لیا۔ اس نے بہتیرا زور کیا کہ اپنا سر اس کے منہ سے چھڑا دے پر کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ وہیں مر کے رہ گیا۔

شہزادے اور موچی کی کہانی وزیر کی زبانی

وزیر نے کہا۔ فارس میں ایک نیک سیرت اور رحمدل بادشاہ تھا اس کے ہاں ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا جس کے کندھے پر ہتھیلی برابر ایک مسّا تھا۔ بادشاہ نے عالموں سے اس علامت کی خاصیت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ پرانی کتابوں میں لکھا ہے جس کے بدن پر ایسا دھبہ ہو اسے خطرے پیش آتے ہیں۔ مگر آخر میں وہ بڑے نصیبے والا ثابت ہوتا ہے بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور شہزادے کی بڑی حفاظت سے پرورش ہونے لگی۔ محل کے قریب ہی ایک موچی کا گھر تھا۔ بادشاہ اس خیال سے کہ ہمسایہ ہے موچی پر مہربانیاں کرتا رہتا تھا اور اس کی زندگی بہت آسودگی سے گزر رہی تھی۔ جب شہزادہ چار سال کا ہوا اور کھیل کود کا شوق پیدا ہوا اکثر موچی کے ہاں چلا جاتا اور وہیں گھنٹوں کھیلا کرتا۔ وزیر کو خبر ہوئی تو بادشاہ سے کہا، یہ اچھا نہیں بچوں کی طبیعت بہت نرم ہوتی ہے اور جس طرف موڑو آسانی سے مڑ جاتی ہے۔ کہیں موچی کی بُری عادتیں شہزادے کو نہ لگ جائیں یہ خلاملا بند کروا دیجیے۔ بادشاہ بولا کہ بچہ ہے اور موچی سے مانوس ہے۔ میں نے منع کیا تو ممکن ہے اس کے ننھے دل کو ٹھیس لگے۔ ذرا بڑا ہو جائے گا اور نیک و بد کی تمیز آ جائے گی تو سمجھا دیں گے۔ وزیر خاموش ہو گیا۔ بادشاہ نے موچی کو بلایا اور کہا، تو ہمارا ہمسایہ ہے اور ہمارے بچے کو تجھ سے پیار ہے۔ تیرا کام ہے کہ اس کی خبر گیری کرے اور آگ پانی سے اس کی حفاظت رکھے۔ موچی نے قدم بوسی کے بعد کہا کہ میں کس قابل ہوں مگر حضور کی ایک نظر سے مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔ شہزادے کی دل و جان سے خدمت کو حاضر

ہوں۔ اب اخلاص یہاں تک بڑھا کہ شہزادہ بعض دفعہ رات کو بھی موچی کے ہاں رہتا، اسی کے ساتھ سیر تماشے کو نکلتا، باغوں میں پھرتا اور اندھیرا ہوئے پر بھی واپس نہ آتا۔ ایک دفعہ بادشاہ کو کوئی ضروری سفر پیش آیا۔ چلتے وقت موچی کو بلا کر شہزادے کو از سر نو اس کے سپرد کیا اور پھر تاکید کر دی کہ اس کا ہر طرح کا خیال رکھو۔ شہر سے کچھ دور ایک شاہی باغ تھا، باغ کیا جنت تھی۔ شہزادے کو اس باغ سے بہت رغبت تھی۔ بادشاہ کی روانگی کے بعد ایک دن حسب معمول ادھر کا رخ کیا۔ موچی اور چند غلام اور ملازم ساتھ تھے۔ باغ میں پہنچ کر موچی نے دیکھا کہ آج شہزادہ مرصع تاج پہنے ہوئے ہے، لباس میں بھی جواہرات ٹنکے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس بدذات کو لالچ آیا اور بے ایمانی کی سوجھی۔ جی میں کہا کہ یہ تاج اور کپڑے سو سوداگروں کی پونجی کے برابر ہیں۔ اس کا باپ شہر سے دور سفر پہ ہے ماں اور محل والے سب میری طرف سے نچنت ہیں۔ کیوں نہ شہزادے کو اٹھا کر کسی دور دراز شہر میں لے جاؤں اور وہاں اس کا تاج اور کپڑے لگے داموں بیچ کر باقی عمر فراغت سے بسر کروں۔ غرض موچی نمک حرامی پر اتر آیا۔ ایک غلام کو اپنے ساتھ ملایا۔ باقی ملازموں اور شہزادے کو کوئی ایسی چیز کھلائی کہ سب بیہوش ہو گئے۔ شہزادے کو ایک صندوق میں ڈالا اور رات ہوئی تو صندوق کو ایک سانڈنی کی پیٹھ پر باندھا، خود ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا، غلام کو دوسرے پر سوار کیا، دو اور کوتل گھوڑے ساتھ لیے، اور اس قافلے سمیت باغ سے رفوچکر ہوا۔ رات بھر سفر کرتے رہے اور کہیں کے کہیں نکل گئے۔ صبح کہیں دم لیا اور پھر چلے یہاں تک کہ سرحد پار کر کے کسی دوسری ولایت جا پہنچے۔ ادھر غلام اور خادم باغ میں دوپہر تک بیہوش پڑے رہے۔ آخر مالی کو خبر ہوئی۔ اس نے روغن بادام اور بہدانا سرکہ ہر ایک کے دماغ میں ٹپکایا تو ہوش آیا۔ دیکھا تو شہزادے اور موچی کا نشان نہیں۔ شہر جا کر ملکہ کو اطلاع دی۔ وہ اسی دم سوار ہو کر باغ میں آئی، اور جب اپنے پھول کو نہ پایا تو کہرام برپا کر دیا۔ لوگوں نے باغ چھان ڈالا، سوار اور پیادے چاروں طرف شہزادے کی تلاش میں روانہ ہوئے لیکن سب بے نیل مرام واپس آ گئے۔ ملکہ کا بیٹے کے غم میں یہ حال ہوا کہ رات تو تڑپتے کاٹی اور صبح ہوتے ہی چل بسی۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو فوراً سفر سے لوٹ کر دارالسلطنت میں پہنچا اور بیوی بیٹے کا کئی دن تک ماتم کرتا رہا۔ آخر صبر کیا۔ موچی نے جواہرات پر قبضہ کیا اور شہزادے کو شام کے ملک میں لے جا کر ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ شہزادہ دس سال تک اسی سوداگر کے گھر میں بڑھتا پلتا رہا اور ایسا خوبصورت جوان نکلا کہ بازار میں نکلتا تو لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور رستے بند ہو جاتے۔ سوداگر سمجھدار آدمی تھا، سوچا کہ اس غلام کو اپنے پاس رکھنا مصلحت نہیں۔ گھر میں چھپا کر رکھوں تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ باہر نکلے تو جھگڑے کا اندیشہ ہے۔ بہتر یہ ہے اسے تحفے کے طور پر فارس کے بادشاہ کے پاس لے جاؤں۔ بہت فیاض بادشاہ ہے یقین ہے دام سے دوگنا انعام مل جائے گا۔ چنانچہ سوداگر نے شہزادے کو فارس لے جا کر بادشاہ کے حضور پیش کر دیا اور اس طرح دس سال کے بعد باپ بیٹا پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ بادشاہ نے سوداگر کو بہت کچھ انعام دیا اور شہزادے کو اپنے خاص غلاموں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں شہزادہ اپنے سب ہمسریوں پر سبقت لے گیا۔ اس کی ایک جوہری سے جو بادشاہ کے خزانے میں ملازم تھا بہت دوستی ہو گئی۔ بادشاہ سے جو کچھ تحفہ یا انعام ملتا اس میں سے جوہری کو ضرور حصہ دیتا۔ جوہری نے جب یہ یگانگت دیکھی تو لالچ آیا کہ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ دل میں کہنے لگا۔ لاؤ غلام کو بہکاؤں اور اس کے ذریعے سے بادشاہ کی خاص انگشتری اڑاؤں۔ انگشتری ہاتھ آ گئی تو پھر خزانے کی مہر توڑ کر سب سے قیمتی اشیاء نکال لوں گا اور دوبارہ مہر لگا دوں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ پس شہزادے سے کہا، تو مجھ پر اتنی مہربانیاں کرتا رہتا ہے، میرا جی چاہتا ہے میں بھی تیری کچھ خدمت کروں۔ بادشاہ کی انگشتری پر ایک ایسا نقش ہے کہ اس کی بدولت ایک جہاں کی حکومت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تو یہ تکلیف کرے کہ جب بادشاہ غافل سو رہا ہو وہ انگوٹھی اتار کر لے آئے تو میں تیرے لیے وہ نقش اتار دوں اور تو چند دن میں بادشاہ بن جائے، لیکن یہ شرط ہے جب تو بادشاہ بن جائے تو مجھے اپنا وزیر مقرر کر دیجیو۔ شاہزادہ جوہری کے بہکائے میں آ گیا۔ رات کو بادشاہ کی خوابگاہ میں داخل ہو کر ہاتھ بڑھایا اور آہستہ آہستہ انگوٹھی اتارنے لگا بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ غلام سے پوچھا یہ کیا حرکت تھی۔ تیرا اس انگشتری سے کیا کام تھا۔ جب شہزادے سے کچھ جواب بن نہ آیا تو بادشاہ کو ایسا غصہ آیا کہ اسی وقت جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ اس گستاخ کی میرے سامنے گردن مار دے۔ جلاد نے مارنے سے پہلے شہزادے کا کرتہ اتارا اور وہی لہسن جو اس کے کندھے پر تھا ننگا ہو گیا۔ بادشاہ کی نظر جو اس نشان پر پڑی تو غش کھا کر گر پڑا۔ جلاد نے ہاتھ روک لیا۔ ذرا دیر بعد بادشاہ کو ہوش آیا تو بیٹے سے لپٹ گیا۔ اس کے سر اور آنکھوں کو چومتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب مصیبت ہم پر اس نمک حرام موچی کی صحبت کے باعث نازل ہوئی۔ شہزادے نے بھی باپ سے معافی مانگی کہ جوہری کی دوستی اس گستاخی کا موجب بنی۔ بادشاہ نے جوہری کو کوڑے پڑوائے اور شہزادے کو بہت نصیحت کی کہ بیٹا، آئندہ رذیلوں کی صحبت سے دور رہنا اور کسی کمینے کو منہ نہ لگانا۔

اس مثل سے صاف پایا جاتا ہے کہ بدذاتوں سے اختلاط میں بہت آفتیں ہیں اور یہ زرگر بھی ایسا ہی کم اصل آدمی ہے۔ اس کو سر پر چڑھانا مناسب نہیں۔ بادشاہ نے وزیر کی بات کو قابل التفات نہ جانا بلکہ کہا کہ بادشاہوں کو ہر ایک کام میں تائید غیبی حاصل ہے۔ اصل نسل کو کسی شخص کی ذاتی شرافت اور قابلیت سے کیا علاقہ ہے۔ عزت علم و ہنر کے سبب ہے، حسب نسب سے نہیں حاکم وقت جسے چن لے وہی برگزیدہ ہے۔ ہم نے اس جوان کو یہ درجہ عطا کیا ہے۔ اور ہمیں امید ہے ہمارا حسن ظن اس کے بارے میں غلط ثابت نہ ہو گا۔ وزیر نے جب دیکھا کہ بادشاہ نہیں مانتا تو زرگر کے خلاف کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا۔ لیکن چند دن ہی گزرے تھے کہ زرگر نے پاؤں پسارنے شروع کر دیے وعدہ وعید سے اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کے مال میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ ایک دفعہ شہزادی کے زیور کے لیے کچھ جواہرات کی ضرورت ہوئی۔ جیسے درکار تھے۔ ویسے نہ بادشاہ کے خزانے میں ملے نہ جوہریوں کے بازار میں دستیاب ہوئے۔ زرگر کو تلاش سے پتا چلا کہ کسی سوداگر کی لڑکی کے پاس ایسے جواہرات موجود ہیں۔ پچھوایا تو اس نے انکار کیا۔ آخر محل میں اسے بلوایا گیا اور زرگر نے شہزادی سے شکایت کی کہ اس کے پاس جواہرات موجود ہیں مگر دیتی نہیں۔ ملکہ سے کہیں اسے حکم دیں کہ حاضر کرے اور ہمارے ہاتھ بازار کے نرخ پہ بیچ دے

اگر سیدھی طرح نہ مانے تو اس سے زبردستی منوایا جائے۔ سوداگر بچی ملکہ کے سامنے پیش ہوئی، قسمیں کھائیں کہ میرے پاس ایسے جواہرات نہیں، بس یہ دو جوڑے ہیں جو حاضر ہیں۔ زرگر بولا یہ کس کام کے، اور ملکہ سے کہا، یہ یوں نہیں ماننے کی۔ شہزادی ناقص العقل اپنے غرور میں مست تھی۔ زرگر شیطان کے کہنے میں آکر حکم دے دیا کہ سوداگر بچی کو شکنجے میں کسا جائے۔ وہ بیچاری اس تکلیف میں ہلاک ہو گئی۔ اس کے لواحقین کو خبر ہوئی تو انہوں نے شہر میں کہرام مچا دیا۔ وزیر نے بادشاہ کو اطلاع کی۔ بادشاہ کو بے حد ملال ہوا، بدنامی کا الگ خیال ہوا۔ سوداگر بچی کے وارثوں کو بلا کر بہت عذر معذرت کی اور ڈھیر سا مال دے کر راضی کیا، بیٹی سے ملنا بات کرنا چھوڑ دیا، اور زرگر کو حکم دیا کہ ہماری نظروں سے دور رہے۔ وہ بادشاہ کے ڈر سے شہر بھاگ گیا۔ ماں بیٹی کی بھی یہ صلاح ہوئی کہ شہزادی جب تک بادشاہ کا غصہ فرو نہ ہو محل میں نہ ٹھہرے چنانچہ وہ شہر کے باہر شاہی چار باغ میں مقیم ہوئی۔ زرگر کو پتا چلا تو ملنے آیا شہزادی نے دیکھتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں اور کہا، خبردار جو پھر میرے سامنے آیا۔ وہاں سے مایوس ہو کر زرگر سراسیمہ و پریشان ایک بیابان میں نکل کھڑا ہوا۔ رات ہوئی آسمان پر بادل چھا گئے، گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا چلا جا رہا تھا کہ ایک گڑھے میں جا پڑا۔ یہ گڑھا شکاریوں نے جنگلی جانوروں کے لیے کھود رکھا تھا اور اس میں پہلے سے تین جانور قید تھے، ایک ببر شیر، ایک بندر اور ایک سانپ۔ یہ تینوں اپنے حال میں ایسے گرفتار تھے کہ ایک دوسرے کو کچھ نہ کہتے تھے۔ چوتھا زرگر بھی شریکِ مصیبت ہو گیا۔ دو تین دن بعد ایک سیاح وہاں سے گزرا اور آدمی کو جانوروں کے ساتھ گڑھے میں گرا دیکھ بے چین ہو گیا۔ جی میں کہا یہ بھی انسان ہے۔ مگر بیچارا اس گڑھے میں نیم جان ہے کسی نہ کسی طرح اس کو بچانا چاہیئے۔ رسی ساتھ تھی۔ گڑھے میں لٹکائی۔ کھینچی تو آدمی کی جگہ بندر نکل آیا۔ دوبارہ کوشش کی تو سانپ برآمد ہوا، اور تیسری دفعہ ببر شیر۔ تینوں سیاح کو دعا دینے لگے اور کہنے لگے تو نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے گو اس وقت ہم اس کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ بندر بولا۔ میں اس پہاڑ کے دامن میں جو شہر سے متصل ہے رہتا ہوں، اگر کبھی تشریف لائیں تو کچھ شکرگزاری کا موقع ہے۔ ببر شیر بولا، میں بھی شہر کے قریب فلاں جنگل میں رہتا ہوں، اگر ادھر سے کبھی گزر ہو تو شاید خدمت بجا لاؤں۔ سانپ نے کہا، میں شہر کے قلعے میں رہتا ہوں، اگر کبھی قدم رنجہ فرمائیں تو شاید اس نیکی کا معاوضہ ادا ہو سکے۔ پھر تینوں یک زبان ہو کر سیاح سے کہنے لگے کہ ہمارا ایک کہنا ضرور مانو، وہ یہ کہ اس آدمی کو گڑھے سے مت نکالو کیونکہ اکثر آدمی بدعہد ہوتے ہیں اور بھلائی کے عوض برائی کرتے ہیں، ظاہر میں انسان ہیں، باطن میں جانوروں سے بدتر ہیں۔ خاص طور پر یہ شخص جو کئی دن تک ہمارا ساتھی رہا ہے، اور جس کی خصلت کا ہمیں اندازہ ہے، یہ تو بالکل ہی وفا اور مروت سے بے بہرہ ہے۔ تو نے ہماری بات نہ سنی تو ایک دن ضرور دکھ پائے گا۔ سیاح نے اس نصیحت پر کان نہ دھرا اور رسی ڈال کر زرگر کو بھی گڑھے سے نکال لیا۔ زرگر نے بہت بہت شکریہ ادا کیا، بادشاہ کی خفگی اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا، اور مصر ہوا اگر کسی دن میرے ہاں ضرور تشریف لایئے تاکہ تھوڑی بہت خدمت بجا لا سکوں۔ سیاح نے کہا۔ اب تو میں سیر و سفر کی نیت سے نکلا ہوں۔ کچھ عرصہ باہر رہوں گا، واپسی پر خدا نے چاہا تو پھر ملاقات ہو گی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ سیاح نے اپنا راستہ لیا، زرگر شہر واپس جا کر گھر میں چھپ بیٹھا۔ بادشاہ اب تک بیٹی سے خفا تھا اور اس کے بارے میں کسی کی سفارش نہ سنتا تھا۔ ایک برس یونہی گزر گیا۔ سیاح شہروں ملکوں کی سیر کرتا ہوا، تین ہزار اشرفیاں کما کر وطن کی طرف لوٹا۔ شہر کے قریب اسی پہاڑ کے دامن میں جہاں بندر کا مسکن تھا۔ شب باش ہوا۔ دو گھڑی رات گزرے دو ڈاکو آئے سب نقد جنس لے گئے اور سیاح کو مشکیں کس کر ایک خطرناک ٹیلے پر جو شارع عام سے دور تھا چھوڑ گئے۔ صبح ہوئی تو بیچارے نے چیختا چلانا شروع کیا۔ اتفاق سے اسی وقت بندر خوراک کی تلاش میں نکلا تھا۔ شور سن کر ٹیلے پر پہنچا تو دیکھا کہ محسن ہاتھ پاؤں بندھے پڑا ہے۔ اسے اس حال میں پا کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پوچھا کیا معاملہ ہے۔ جب سیاح نے چوروں کی سینہ زوری کا قصہ بیان کیا تو بولا، غم نہ کریں ان سے سمجھ لوں گا، پہلے ذرا آپ کے بند کھول دوں۔ جب بند کھل گئے تو بندر سیاح کو اپنے بسیرے میں جو گھاس پھوس کا بنا ہوا تھا لے گیا اور اس کے سامنے تر و خشک میوے لا کر ڈھیر کر دیئے۔ کہنے لگا، آج تم یہیں ٹھہرنا اور آرام کرنا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔ یہ کہہ کر خود چوروں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ چور ساری رات چلتے رہے تھے اور صبح کے قریب تھک کر ایک چشمے کے کنارے سو گئے تھے۔ مال اسباب کی گٹھڑی زمین پر رکھی تھی۔ اتنے میں بندر آ پہنچا۔ چوروں کو غافل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ گٹھڑی کو پھاڑ کر پہلے اشرفیاں نکالیں اور کچھ دور لے جا کر مٹی میں دبا دیں۔ جب دیکھا کہ چوروں کو کچھ خبر نہ ہوئی دوبارہ گیا اور سیاح کے کپڑے نکال کر کہیں چھپا دیئے۔ غرض اسی طرح نہ صرف سیاح کا سب مال اسباب بلکہ چوروں کی کئی چیزیں بھی اڑا کر مختلف جگہ رکھ آیا اور پھر دور ایک درخت پر جا بیٹھا کہ دیکھے چور کیا کرتے ہیں۔ جب چوروں کی آنکھ کھلی اور معلوم ہوا کہ سب سامان غائب ہے تو گھبرا کر ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ دونوں میں سے جو بڑا تھا بولا، بھائی یہاں آس پاس کسی آدمی کے قدموں کا نشان نہیں یہ انسان کا کام نہیں۔ میرا خیال ہے یہ چشمہ جنوں پریوں کا مسکن ہے۔ ہم یہاں آئے اور پاؤں پھیلا کر سو گئے، انہوں نے اس گستاخی کا بدلہ لیا ہے۔ ابھی تو شکر ہے انہوں نے ہمارے مارنے کا قصد نہیں کیا بہتر یہی ہے کہ یہاں سے جان سلامت لے کر بھاگ چلیں۔ ان کی طرف سے خاطر جمع کر کے بندر گھر واپس آیا اور سیاح کو سب کیفیت سنائی۔ رات کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی چشمے کے کنارے لے گیا سب چیزیں دکھائیں۔ سیاح نے فقط اپنی چیزیں لے لیں اور بندر سے رخصت ہو کر شہر کی طرف چلا۔ اتفاقاً اسی جنگل سے گزر ہوا جہاں ببر شیر رہتا تھا اور دور سے شیر بھی غراتا ہوا نمودار ہوا۔ سیاح سہم کر بچنے کی فکر میں تھا کہ ببر نے آواز دی، ڈرو مت، میں تو تمہارا خادم ہوں نہایت گرمجوشی سے ملا اور کہا کہ ایک گھڑی یہیں توقف کرو، میں ابھی آیا۔ یہ کہہ کر مہمان کے لائق تحفے کی تلاش میں چل دیا۔ پھرتے پھرتے چار باغ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر گھسا تو دیکھا کوئی لڑکی ایک قیمتی زیور گلے میں پہنے حوض کے کنارے بیٹھی ہے۔ ایک پنجے سے بیچاری کا کام تمام کیا اور زیور لے جا کر سیاح کی نذر کیا۔ سیاح شیر سے رخصت ہو کر پھر شہر کی طرف چلا۔ راستے میں زرگر کا خیال آیا اور جی میں کہا، جانوروں نے جب

اپنے عہد کو ایسی اچھی طرح نباہا تو آدمی بیری کیا کچھ خاطر تواضع نہ کرے گا۔ اس کی مدد سے اشرفیاں اور یہ گرانبہا زیور بھی اچھے داموں پر فروخت ہو سکیں گے۔ کیونکہ خود زرگر ہے اور سب کچھ جانتا پہچانتا ہے۔ صبح کا وقت تھا جب سیاح شہر میں داخل ہوا۔ اس وقت تک شہزادی کی موت کی خبر سارے شہر میں مشہور ہو چکی تھی اور سب لوگ روتے دھوتے بادشاہ کے محل کی طرف جا رہے تھے۔ زرگر بھی حادثے کی تفصیل دریافت کرنے کو گھر سے نکل آیا تھا۔ اور کسی واقف کار کی تلاش میں تھا کہ اتنے میں سیاح پر نظر پڑی۔ بہت خوشی کا اظہار کیا اور اپنے گھر لے گیا۔ مزاج پرسی کے بعد پھر اپنا دکھڑا سنانے لگا اور مفلسی و تنگی کی شکایت کی۔ سیاح نے کہا فکر نہ کرو میرے پاس کچھ اشرفیاں ہیں اور ایک زیور بھی ہے جس میں بہت سے جواہرات جڑے ہوئے ہیں تجھے زر و گوہر کی خوب پہچان اور پرکھ ہے۔ انہیں بیچ دے اور داموں میں سے جتنا چاہے اپنے لیے لے لے۔ سیاح نے زیور نکالا تو شہزادی کا تھا۔ زرگر کی فوراً نیت بدل گئی۔ کہنے لگا اس کی قیمت کا تو حد و حساب نہیں ابھی ابھی تجھے مالا مال کیے دیتا ہوں۔ تو یہاں ٹھہر جب تک میں واپس آؤں۔ دل میں سوچا خوب موقعہ ہاتھ آیا، اس سے فائدہ نہ اٹھاؤں تو احمق ہوں۔ بادشاہ مجھ سے ناراض ہے اور اسی وقت سوگوار بیٹھا بیٹی کے قاتل کا متلاشی ہے۔ اگر میں اس سیاح کو اس کے حوالے کر دوں تو وہ غالباً پھر مجھ پر پہلے کی طرح مہربان ہو جائے گا۔ یہ ٹھان کر سیدھا محل پہنچا اور اطلاع کروائی کہ شہزادی کے قاتل کو مع زیور میں نے گرفتار کر لیا ہے۔ بادشاہ نے بلایا اور زیور دیکھا۔ پیادے بھیجے کہ سیاح کو پکڑ لائیں۔ سیاح کو لائے تو وہ زرگر سے کہنے لگا، تو نے دوست بن کر وہ کیا جو آج تک کسی دشمن نے نہیں کیا تھا۔ خیر میرے اپنے کیے کی سزا ہے اور جو سزا ملے کم ہے۔ بادشاہ نے سمجھا کہ اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہے، زیور تو اس کے پاس سے نکلا ہی ہے۔ حکم دیا کہ قاتل کو شہر میں پھرایا جائے اور کل تک قید میں رکھا جائے۔ جب تعزیت کی رسموں سے فراغت ہوگی تو اسے قصاص میں پھانسی دی جائے گی۔ جس وقت سیاح کو شہر میں پھرا رہے تھے تو سانپ قلعے پر سے نظارہ کر رہا تھا۔ جب اپنے دوست کو اس حال میں دیکھا تو پیچھے پیچھے ہو لیا اور جب وہ کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تو اس سے ملا۔ حقیقت معلوم ہوئی تو بولا، میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ انسان بے وفا ہے اور نیکی کا بدلہ بدی سے دیتا ہے۔ تو نے ہمارا کہنا نہ سنا۔ میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تجھے ضرور اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ سیاح نے کہا بھائی اب زخم پر نمک چھڑکنے سے کیا حاصل، تیرا کہا نہ ماننے کی رسوائی جو ہونی تھی سو ہو چکی۔ اب کوئی ایسی تدبیر کر اس مصیبت سے رہائی ہو سکے۔ سانپ نے کہا میں نے کل بادشاہ کی ماں کو کاٹ کھایا تھا، وہ بیہوش پڑی ہے اور سارا شہر اس کے علاج سے عاجز آ چکا ہے۔ یہ ایک بوٹی دیتا ہوں، اپنے پاس رکھ۔ علی الصباح جب کوئی آدمی آئیں اور تجھ سے علاج کیلئے کہیں تو بادشاہ کے حضور میں جا کر پہلے اس سے اپنی تمام کہانی کہو اور پھر یہ بوٹی اس کی ماں کو کھلا دو، وہ اچھی ہو جائے گی۔ شاید اس طرح تیری خلاصی ہو جائے۔ یہ کہہ کر اور بوٹی دے کر سانپ اپنے گھر چلا گیا اور صبح ہی صبح بادشاہ کے کوٹھے پر چڑھ کر روشندان میں سے آواز دی کہ سانپ کے کاٹے کا علاج اس بے گناہ کے پاس ہے جسے بادشاہ نے کل قید کیا تھا۔ بادشاہ اس وقت اپنی ماں کے سرہانے ماں اور بیٹی کے دوہرے غم میں مبتلا بیٹھا طبیبوں سے مشورہ کر رہا تھا۔ کسی دارو یا تریاق سے فائدہ نہ ہوتا تھا۔ سانپ کی آواز سنی تو نوکروں سے کہا چھت پر جا کر دیکھیں کون بول رہا ہے۔ نوکروں نے بہت تلاش کی، کوئی نظر نہ آیا۔ سب کا خیال ہوا یہ ہاتف غیبی کی ندا تھی۔ سیاح کو قید خانے سے کھول کر بادشاہ کے سامنے لائے۔ علاج کو کہا گیا تو سیاح نے جواب دیا کہ اس زہر کا علاج میرے ہاتھ میں ہے، خدا چاہے تو ملکۂ جہاں ایک دم تندرست ہو جائیں گی۔ لیکن پہلے حضور مجھ مصیبت زدہ کی تھوڑی سی رام کہانی سن لیں۔ بادشاہ نے اجازت دی تو سیاح نے بے دھڑک ہو کر جیسا کہ راستبازوں کا طریقہ ہے تمام واقعات جو اس پر گزرے تھے شروع سے لے کر آخر تک دہرا دیے۔ بادشاہ کو یقین آ گیا کہ بے گناہ ہے۔ اب وہ بوٹی دودھ میں حل کر کے ملکہ کو کھلائی گئی، اس نے کھاتے ہی آنکھیں کھول دیں اور ذرا سی دیر میں اٹھ بیٹھی۔ بادشاہ نے سیاح کو بہت انعام اکرام عطا کیا اور نوازش فرمائی۔ ادھر زرگر اپنے گھر میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کب سیاح مرے اور میں اس کی اشرفیوں پر قبضہ کروں اور پھر بادشاہ کا مقرب بن کر پہلے کی طرح دندناؤں اتنے میں ایکا ایکی بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سیاح کی جگہ زرگر کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اس ملک میں افترا پردازی کی یہی سزا مقرر تھی، یعنی اگر کوئی کسی پر جھوٹی تہمت لگا کر اسے کوئی قانونی سزا دلوانا چاہتا تھا تو جھوٹ ثابت ہونے پر خود اس سزا کا مستوجب گنا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی دستور کے مطابق اس بے وفا بے مروت زرگر کو بھی دار پر کھینچا گیا اور زمانہ اس کے ناپاک وجود سے یکسر پاک ہوا۔

یہاں ختم ہوئی مثل اس بات کی کہ بادشاہوں کو کیسے مقرب اختیار کرنے چاہئیں اور آنکھیں اور کان کیسے کھلے رکھنے چاہئیں۔ اگر بادشاہ حلب اس بد اصل بے ادب کی پرورش نہ کرتا تو اس کی بیٹی خون ناحق کی مرتکب نہ ہوتی، اور اس گناہ کی پاداش میں شیر ببر کا شکار نہ ہوتی۔ اگر بادشاہ سیاح ستم رسیدہ کی بات نہ سنتا تو حق و باطل میں تمیز نہ کر سکتا۔ حکمرانوں کو چاہیئے کہ بغیر دیکھے بھالے کسی کی پرورش نہ کریں اور بغیر سوچے سمجھے کسی کو سزا نہ دیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور بدی کا بدلہ ملے بغیر نہیں رہتا۔ اب جب کہ خدا نے ان کو یہ زور و طاقت عطا کر رکھا ہے انہیں ایسے کاموں میں سعی کرنی چاہیئے۔ جن کی وجہ سے دنیا میں نیک نامی اور عاقبت میں نجات نصیب ہو۔

تقدیر پر تکیہ

جب بادشاہ نے یہ پُر حکمت حکایت سنی تو بیدپائے سے کہا کہ میں آپ کو بہت تکلیف دے رہا ہوں، بلکہ آپ کا اتنا زیادہ وقت اپنے تصرف میں لا کر سوءِ ادبی کی حد تک پہنچ چکا ہوں۔ لیکن اس داستان کے بعد، جس سے کمینوں اور رذیلوں کی صحبت کے نقصان ظاہر ہوتے ہیں، اب از راہ عنایت چودھویں اور آخری وصیت کی توضیح بھی فرما دیجیے جس سے معلوم ہو کہ کیوں عالم و عاقل بسا اوقات رنج و محن میں گرفتار رہتا ہے اور کیوں جاہل و نادان آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ برہمن نے جواب دیا کہ اے بادشاہ دولت و سعادت کے اسباب ہیں، جو شخص ان اسباب کو کام میں لاتا ہے وہ کامیابی کا مستحق ہے۔ لیکن سب

جد و جہد کے نتیجے اور ثمرے تقدیر پر منحصر ہیں اور اگر مشیت ایزدی نہ ہو تو سب حیلے وسیلے بیکار ہیں۔ اسی لیے بہت سے دانا نانِ شبینہ کے محتاج ہیں اور بہت سے جاہل حکومتیں کر رہے ہیں۔ قضائے الٰہی کے بغیر خرد، ہنر، حسن و جمال کسی چیز کا کچھ فائدہ نہیں۔ ایک شہزادے نے یہی مضمون شہر نسطور کے دروازے پر یادگار کے طور پر لکھ رکھا ہے اس کی داستان بہت رنگین و شیریں ہے۔ دلشاد ابشلیم نے پوچھا یہ کیا قصہ تھا۔

شہزادے اور ساتھیوں کی کہانی بیدپائے کی زبانی

برہمن نے کہا۔ روم کے کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا جس کے دو ہونہار اور قابل فرزند تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو بڑے بھائی نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور چھوٹے نے عافیت اس میں دیکھی کہ وطن کو خیرباد کہے۔ کچھ زادِ سفر لے کر اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ سارا سارا دن مسافت طے کرنے کے بعد شام کو ایک جگہ مقام کیا۔ غربت اور تنہائی سے طبیعت بہت گھبرائی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سوچنے لگا ابھی تو پہلا دن ہے۔ یہ منزلیں کیسے کٹیں گی۔ خیر جوں توں کر کے وہیں رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو کہیں سے ایک نہایت حسین جوان آنکلا۔ اسے دیکھ کر شہزادے کی سب کلفت دور ہو گئی دونوں آپس میں ملے اور ہمدم و ہم سفر بن گئے۔ وہ بیابان گویا گلستان بن گیا۔ دوسری منزل میں ایک سوداگر بچہ بھی جو کاروبار میں نہایت ہوشیار تھا، ہمراہ ہو گیا اور اس طرح وہ تین ہو گئے۔ تیسرے دن ایک ہٹا کٹا کسان کا لڑکا جو اپنے کام میں ماہر تھا ساتھ ہو لیا اور اس کی شرکت سے چار یار کی ٹولی مکمل ہو گئی۔ ہنستے کھیلتے، باتیں کرتے، دشت و صحرا میں چلے جاتے تھے۔ دو مہینہ سفر کے بعد شہر نسطور کے قریب پہنچے اور فصیل کے نیچے اترے۔ توشہ وغیرہ سب ختم ہو چکا تھا اور کسی کے پاس پیسہ تک نہ تھا۔ ایک نے کہا مصلحت یہ ہے کہ سب اپنے اپنے ہنر کے زور سے کچھ کمائی کریں تاکہ اس شہر میں چند روز فراغت سے ٹھہر سکیں۔ شہزادے نے کہا سب کام تقدیر سے وابستہ ہیں۔ انسان کی کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ عقل مند وہی ہے جو دنیا کے پیچھے نہیں لگتا جو کچھ قسمت میں ہے مل جائیگا۔ حسین نوجوان نے کہا حسن کی جہاں میں بڑی مانگ ہے۔ دولت اس کی لونڈی ہے، حسین جہاں جائے اُسے کسی چیز کی کمی نہیں۔ سوداگر بچہ بولا، واہ دنیا میں حُسن کو کون پوچھتا ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں عقل اور سمجھ درکار ہے۔ دہقان زادے نے کہا، خالی عقل تدبیر سے سب جگہ کام نہیں چلتا۔ بہت سے عقل مند مارے مارے پھرتے ہیں۔ اصل چیز محنت و مشقت ہے۔ تبھی کسان اور پیشہ ور لوگ سیدھے سادے ہونے کے باوجود کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ تینوں نے شہزادے سے درخواست کی کہ اس بارے میں مزید اپنی رائے بیان فرمائیں۔ شہزادے نے کہا، میں پھر وہی کہوں گا کہ ہر ایک کی روزی مقدر ہے۔ میں حُسن، عقل یا کسب کا منکر نہیں، لیکن اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو یہ سب ہیچ ہیں، اور خدا کی مرضی ہو تو بے سبب اور بے مشقت بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ پس ہر حال میں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ بڈھا کسان اسی توکل کی بدولت جلد اپنے مطلوب کو پہنچا اور قید محنت سے آزاد ہوا۔ ساتھیوں نے پوچھا یہ کیا قصہ تھا۔

* * *

دہقان اور اشرفیوں کی کہانی شہزادے کی زبانی

شہزادے نے کہا اندلس میں ایک دہقان تھا۔ ایک دفعہ کچھ عرصے تک اس کی آمدنی خرچ سے زیادہ رہی اور اس بچت میں تین سو دینار اس کے پاس جمع ہو گئے دہقان نے اس رقم کو بہت سینت کے رکھا، ایک حبہ بھی کم نہ ہونے دیا۔ روز دیناروں کی تھیلی نکالتا، گنتا اور پھولے نہ سماتا۔ ایک دن حسب معمول دینار گن کر تھیلی میں بھرے اور کسی محفوظ جگہ رکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ایک دوست نے آواز دی۔ دہقان گھبرایا کہ کہیں دوست اندر گھس آئے اور تھیلی دیکھ لے اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا، پاس پانی کا مٹکا رکھا تھا، اس میں تھیلی ڈال دی۔ دوست آیا اور اندر اسی دیر میں دونوں کسی ضروری کام پر گاؤں چل دیئے جانے سے پہلے دہقان نے بیوی کو تاکید کر دی کہ میری واپسی تک کھانا ضرور تیار کر لینا۔ پیچھے بیوی کو دیئے کے لیے پانی کی ضرورت ہوئی۔ تو دیکھا مٹکے میں ایک بوند نہیں۔ اتفاق سے گاؤں کا قصائی گائے خریدنے شہر آیا تھا اور اس وقت گلی میں سے گزر رہا تھا۔ چونکہ جان پہچان کا آدمی تھا۔ دہقان کی بیوی نے اس سے کہا، بھائی تھوڑا سا پانی تو لا دے، ثواب کا کام ہے۔ قصائی راضی ہو گیا اور اس نیک بخت نے وہی اشرفیوں والا مٹکا اس کے حوالے کر دیا۔ قصائی مٹکا پیٹھ پر لاد کر پانی لانے چلا تو اندر کوئی چیز ہلتی معلوم ہوئی۔ ہاتھ ڈال کر دیکھا تو دیناروں کی تھیلی تھی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر بجا لایا کہ بے تردد یہ دولت غیر مترقبہ ہاتھ آئی۔ جی میں کہا اسے تلف کرنا ناشکری ہوگی۔ مناسب یہ ہے اپنا کام کرتا رہوں اور اس روپے کو ضرورت کے وقت کے لیے اٹھا رکھوں۔ خوشی میں مٹکا پانی سب بھول گیا۔ روپیہ جو گاؤں سے ساتھ لیا تھا، اسی سے ایک جوان موٹی سی گائے خریدی اور گھر کا رخ کیا۔ شہر سے نکل کر خیال آیا کہ تھیلی اپنے پاس رکھی تو چوروں کا کھٹکا ہے، شہر میں کہیں دفن کی تو ہر وقت فکر رہے گا۔ کوئی ایسا نہیں جس کے پاس امانت رکھوا جاؤں، آج کل کے لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔ بہتر یہ ہے تھیلی اس گائے کے منہ میں ٹھونس کر کسی طرح حلق سے نیچے اتار دوں۔ جب ذبح ہو گی نکال لوں گا۔ پس بیچاری گائے کو زبردستی تھیلی نگلوادی اور رسی پکڑ کے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں بیٹا ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر حاضری میں اور دو تین شہر کے ضروری کام نکل آئے۔ گائے کی رسی بیٹے کے حوالے کی اور خود ان کاموں کو نبٹانے کے لیے واپس شہر کو چلا۔ اُدھر دہقان کام سے فارغ ہو کر گاؤں سے آ رہا تھا۔ جو عرصے سے ایک فربہ گائے کی قربانی کی نیت کر رکھی تھی۔ ایسا اچھا تازہ جانور دیکھ کر خریدنے کا فیصلہ کر لیا اور قصائی کے لڑکے کو اس کے منہ بولے دام سے زیادہ دے کر گائے گھر لے آیا۔ قربانی کا اہتمام کر رہا تھا کہ ایکا ایکی تھیلی یاد آئی۔ مٹکے کی تلاش کی تو ندارد تھا۔ بیوی سے پوچھا اور حقیقت کھلی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دیر تک دیناروں کا ماتم کرتا رہا۔ وہ روتا تھا اور قسمت ہنستی تھی۔ جب دل ذرا ٹھہرا تو کہنے لگا جو ہونا تھا سو ہوا۔ لاؤ قربانی کریں۔ گائے حلال ہوئی اور آنتیں نکلیں تو ناگاہ تھیلی پر نظر پڑی خوشی سے مدہوش ہو گیا۔ حواس درست ہونے پر تھیلی اٹھائی، صاف کی، اشرفیاں نکالیں ایک ایک اشرفی اٹھا کر چومتا تھا، آنکھوں سے ملتا تھا اور رکھ دیتا تھا پھر سوچا کہ عجب اتفاق سے یہ کھویا ہوا سونا ملا ہے، ایسے معجزے روز روز

نہیں ہوتے، اب اس تھیلی کی جگہ اپنی کمر کے سوا نہ ہوگی واقعی ہر وقت تھیلی کمر سے باندھے رہنے لگا، ایک دم کو جدا نہ کرتا تھا۔ بیوی اس پر ملامت کرتی تھی کہ یہ توکل کے خلاف ہے، خدا سب کا روزی رساں ہے، یوں روپے کا لالچ کرنا اچھا نہیں۔ دہقان کہتا تھا دنیا عالم اسباب ہے، اپنی طرف سے احتیاط اور نگہداشت میں کوتاہی نہ ہونی چاہیئے، آگے خدا مالک ہے۔ ایک دن چشمے پر نہا رہا تھا اور تھیلی کھول کر کنارے پر رکھ دی تھی۔ نہا کر کپڑے پہنے اور تھیلی وہیں بھول کر چل دیا۔ دہقان کے جاتے ہی ایک گڈریا اپنی بکریوں کو پانی پلانے چشمے پر آیا۔ تھیلی پڑی دیکھ کر اٹھائی، تو اشرفیاں تھیں۔ نہال ہوگیا، گھر پہنچ کر گنیں تو پوری تین سو تھیں۔ اس نے بھی دہقان کی طرح یہی ٹھیک کیا کہ ان اشرفیوں کو وقت بے وقت کے لیے رکھ چھوڑوں گا اور بکریاں چراتا رہوں گا۔ اتنے میں دہقان کو تھیلی یاد آئی۔ بھاگا ہوا چشمے پر واپس پہنچا، ادھر ادھر تلاش کی، کہیں ہوتی تو ملتی۔ مغموم گھر آیا اور بیوی سے اس سانحے کا ذکر کیا۔ وہ پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔ میاں کی خوب فضیحتیاں کیں کہ کم بخت ہر وقت روپیہ سینے سے لگائے پھرتا تھا اور بال بچوں کی تنگی کا ذرا خیال نہ کرتا تھا۔ اب بیٹھ کے اس تھیلی کو رو۔ دہقان نے کہا، سچ کہتی ہے۔ مجھے اپنے کیے کی سزا ملی۔ اس کے بعد توبہ کی کہ اب مال جمع نہ کروں گا، جو کچھ ہاتھ میں آئے گا۔ خرچ کر دیا کروں گا۔ ادھر دہقان نے یہ عہد کیا، ادھر گڈریا اشرفیاں بغل میں دبائے بکریاں چراتا پھرتا تھا۔ ایک دن کسی کنوئیں کے قریب گلے سمیت ٹھہرا تھا کہ دور سے کچھ سوار آتے دکھائی دیئے۔ اس ڈر سے کہ کہیں اشرفیاں نہ چھین لیں، تھیلی کنوئیں میں پھینک دی۔ اندھیرا ہو چلا تھا، اس لیے تھیلی وہیں چھوڑ کر بکریوں کو گھر کی طرف ہانک لے گیا۔ اتنے میں دہقان کا وہاں سے گزر ہوا، ہوا ایسی تیز چل رہی تھی کہ اس کی پگڑی سر سے اڑ کر کنوئیں میں جا پڑی۔ نکالنے کو کنوئیں میں اترا اور پگڑی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک تھیلی ہاتھ آگئی خدا کا شکر کیا اور گھر جا کر بیوی کو قصہ سنایا۔ گنیں تو تین سو اشرفیاں تھیں، نہ کم نہ زیادہ۔ دہقان نے کہا، جتنا کھویا تھا اتنا ہی خزانہ غیب سے مل گیا، اب جو عہد کیا تھا، پورا کروں گا۔ کچھ بال بچوں پر صرف کیا کچھ خدا کی راہ میں دیا یہاں تک کہ تین سو میں سے دو سو خرچ کر ڈالیں۔ اب گڈریے کی سنو۔ بکریوں کو گھر چھوڑ کر واپس آیا اور کنوئیں میں اترا تو تھیلی غائب تھی، دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ رات دن تھیلی کے غم میں حیران و پریشان رہنے لگا۔ ایک دفعہ شہر گیا تو دہقان سے ملاقات ہوگئی۔ دہقان مہمان نواز آدمی تھا، گڈریے سے کہا کھانا میرے ہاں کھاؤ۔ کھانے کے بعد دونوں باتیں کرنے لگے۔ لیکن گڈریے کے لب و لہجہ سے ایک طرح کی افسردگی ٹپکتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے ایک دم آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دہقان نے سبب پوچھا تو بولا، روؤں نہیں تو کیا کروں میرے پاس تین سو دینار تھے جو میرے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور تھے ایک دن میں نے کسی ظالم کے ڈر سے فلاں کنوئیں میں ڈال دیئے اور پھر ان کا نشان پتا نہ پایا۔ دہقان یہ سن کر بہت کبیدہ خاطر ہوا۔ اسی وقت کسی بہانے سے اٹھ کر اندر گیا۔ اور بیوی سے کہنے لگا کہ یہ روپیہ جسے ہم حلال روزی سمجھ کر یوں اڑاتے رہے دراصل اس مہمان کا مال تھا۔ ہم سے بڑی غفلت ہوئی۔ اب یہی تلافی ممکن ہے کہ جو کچھ بچا ہے بطور ہدیہ اس کو پیش کر دیں اور کچھ نہ کہیں۔ اگر اسے معلوم ہوگیا تو سارے کا مطالبہ کرے گا اور ہمارا یہ مقدور نہیں کہ سارا ادا کر سکیں۔ بیوی نے اس تجویز سے اتفاق کیا، بولی حقدار کا حق دینا چاہیئے اور صبر و شکر سے رہنا چاہیئے خدا بھلا کرے گا۔ دہقان نے سو دینار جو بچے تھے گڈریے کی نذر کیے۔ وہ لے کر بہت ممنون ہوا اور دل میں کہنے لگا اچھا شگون ہے، خدا چاہے تو باقی دو سو بھی کہیں سے مل جائیں گے۔ اب بہتر یہ ہے ان کی پوری حفاظت کروں تاکہ دوبارہ زخم نہ کھاؤں۔ گڈریے کے پاس ایک موٹی سی لکڑی تھی جس سے بکریاں ہانکا کرتا تھا، اس کا ایک حصہ کھوکھلا کر کے اشرفیاں بھر دیں۔ ایک دن کسی بڑی ندی کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی چھوٹ کر پانی میں جا پڑی اور بہت کوشش کے باوجود ہاتھ نہ آئی۔ یہ ندی شہر میں سے گزرتی تھی اور دہقان اس میں نہا رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک لکڑی اس کی طرف بہتی چلی آرہی ہے۔ قریب آئی تو پکڑ لی اور گھر لے آیا۔ بیوی بیٹھی کھانا پکا رہی تھی اور ایندھن تھڑ گیا تھا۔ دہقان جلانے کو لکڑی کے ٹکڑے کرنے لگا تو چھنا چھن اشرفیاں گرنی شروع ہوئیں۔ پوری سو تھیں۔ سجدۂ شکر بجا لایا اور پھر دل کھول کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ دو تین دن بعد گڈریا پھر آیا، اب کے پہلے سے بھی زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ لکڑی اور اشرفیوں کا قصہ سنایا۔ دہقان نے سن کر پوچھا سچ سچ بتا، وہ اشرفیاں جو پہلے کھوئی گئی تھیں تیرے ہاتھ کہاں سے آئی تھیں یا کیسے جمع ہوئی تھیں۔ گڈریے نے صاف بتا دیا کہ اس طرح فلاں وقت فلاں چشمے کے کنارے تھیلی پڑی ملی تھی اور اس میں تین سو دینار تھے وہی تھیلی میں نے کنوئیں میں ڈال دی تھی۔ دہقان مسکرا کر کہنے لگا، خدا کا شکر ہے کہ جس کا حق تھا اسی کو دلوا دیا۔ وہ تھیلی میری تھی اور میں ہی چشمے کے کنارے بھول گیا تھا۔ مجھے ہی کنوئیں میں سے ملی، اور اسی میں سے سو دینار جو باقی بچے تھے تجھے دے دیئے تھے۔ پھر لکڑی بھی میرے ہی ہاتھ آئی اور وہی سو دینار آج کل خرچ کر رہا ہوں۔ گڈریا حیران رہ گیا اور بولا اس عجیب و غریب حکایت سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی روزی کوئی دوسرا نہیں چھین سکتا۔

یہ مثل بیان کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ ہم بھی قناعت اور توکل کے دائرے سے باہر قدم نہ دھریں اور مال و جال پر بھروسا نہ کریں۔ کیونکہ ہر ایک کام کا انجام پردۂ قضا میں مخفی و مستور ہے۔ غرض وہ دن انہی بحثوں میں گزر گیا۔ دوسرے دن صبح دہقان زادے نے کمر کسی اور اپنے ساتھیوں سے کہا، تم آج آرام کرو میں شہر جاتا ہوں اور اپنی کوشش سے کچھ کما کر لاتا ہوں۔ کل تم میں سے کوئی اور جائے اور قسمت آزمائے۔ سب نے اس پر اتفاق کیا۔ دہقان زادہ دوستوں سے رخصت ہوکر شہر کے دروازے پر پہنچا اور لوگوں سے پوچھا آج کل اس شہر میں کس چیز کی زیادہ مانگ ہے۔ معلوم ہوا لکڑی بہت مہنگی ہو رہی ہے۔ فوراً پہاڑ پر گیا اور وہاں سے سوکھی لکڑیوں کا بڑا سا گٹھڑ باندھ کر شہر لے آیا۔ ہاتھوں ہاتھ دس درم میں بک گئیں۔ اس روپے سے مزے مزے کی کھانے کی چیزیں خریدیں اور دوستوں کی طرف چلا۔ شہر سے نکلتے وقت دروازے پر لکھا پایا کہ ایک دن کی محنت مزدوری کا نتیجہ دس درم ہے۔ اس دن دہقان زادے کی کمائی سب دوستوں نے مل کر اڑائی۔ دوسرے دن تجویز ہوئی کہ آج خوبصورت جوان جائے، اور اپنے حسن کے بل پر یا دوں

کے لیے کچھ آسائش کا سامان لائے۔ جوان اٹھا اور شہر کی طرف چلا مگر متفکر تھا کہ میں کوئی کام نہیں جانتا کیسے کچھ کماؤں گا یا کیونکر دوستوں کے پاس خالی ہاتھ جاؤں گا۔ اسی سوچ میں شہر میں داخل ہوا اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ایک کوچے میں سڑک کے کنارے غمگین بیٹھ گیا۔ اس گلی میں ایک مالدار عورت رہتی تھی۔ اس نے جو کھڑکی میں سے ایک خوبرو جوان کو یوں پریشان حال بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بہت ترس آیا کہ معلوم نہیں کس کا لعل ہے جو یوں مٹی میں رُل رہا ہے۔ لونڈی کو بھیجا کہ بُلا لائے۔ جب جوان آیا اور پتا چلا کہ مسافر ہے تو دن بھر اپنے ہاں مہمان رکھا اور چلتے وقت سو درم اس کی نذر کیے جوان نے دوستوں کے لیے سامان خریدا اور آتے ہوئے شہر کے دروازے پہ لکھ دیا کہ حسن کے ایک دن کے دام سو درم ہیں۔ تیسرے دن سوداگر بچے سے یاروں نے کہا کہ آج تمہاری عقل کا امتحان ہے۔ وہ شہر کے دروازے پہ پہنچا تو دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کشتی طرح طرح کے نفیس مال سے لدی کھڑی ہے اور اہل شہر اس کے خریدنے میں لیت و لعل کر کے قیمت گرانے کی فکر میں ہیں۔ سوداگر بچے نے جھٹ واجبی داموں میں سودا کر لیا اور کھڑے کھڑے سارا مال نیلام کر کے ہزار دینار منافع کما لیا۔ دوستوں کے لیے بہت سے تحفے تحائف خریدے اور جاتے وقت شہر کے دروازے پر لکھ آیا کہ عقل کی ایک دن کی کمائی ہزار دینار ہے۔ چوتھے دن شہزادے سے یاروں نے کہا آپ ہر وقت توکل کی ڈینگیں ہانکتے رہتے ہیں۔ اب دیکھیں آپ کا توکل ہمارے بھی کام آتا ہے یا نہیں۔ شہزادہ جھٹ تیار ہو گیا اور اللہ کا نام لے کر بادل پر سمت شہر کی سمت روانہ ہوا۔ اتفاق سے اسی دن شہر کے بادشاہ کا انتقال ہوا تھا اور سب لوگ تعزیت میں مشغول تھے۔ شہزادہ بھی نظارہ کرنے محل میں جا گھسا اور ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ دربان نے دیکھا کہ اور سب تو جزع فزع کر رہے ہیں اور ایک اجنبی کونے میں دوسروں کے خلاف چُپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس خبط میں کہ کوئی جاسوس ہے پکڑ لیا اور ردق کرنے لگا۔ شہزادے نے نرمی و دلیل سے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ جب جنازہ لے کر چلے تو شہزادہ وہیں ٹھہرا رہا اور محل کی سیر کرنے لگا۔ اس پر دربان اور بگڑا اور اجنبی نوجوان کو پکڑ کر قید خانہ میں بند کر دیا۔ جب رات ہو چلی اور شہزادہ واپس نہ آیا تو اس کے ساتھی بہت پریشان ہوئے۔ اور آپس میں کہنے لگے، وہ بےچارہ توکل کا قائل تھا۔ معلوم ہوتا ہے جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو شرم کے مارے کسی اور طرف چل دیا۔ کاش کہ ہم اسے یہ تکلیف نہ دیتے اور اس کا دل نہ دُکھاتے۔ اُدھر شہزادہ بندِ زندان میں گرفتار دوستوں کو یاد کر رہا تھا اور ان کی جُدائی میں بےچین تھا۔ دوسرے روز سلطنت کے امیر کبیر اکٹھے ہوئے کہ بادشاہ کا جانشین منتخب کریں کیونکہ اس ملک کی بادشاہت موروثی نہ تھی۔ جب زور و شور سے بحث جاری تھی تو دربان نے اہل مجلس سے کہا کہ آپ کو یہ کارروائی خفیہ طور پر کرنی چاہیے۔ ابھی کل ہی میں نے ایک جاسوس پکڑا ہے، ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی یہاں موجود ہو اور آپ میں اختلاف رائے دیکھ کر کوئی فتنہ کھڑا کروا دے سب کی رائے ہوئی کہ جاسوس کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی جائے۔ جب شہزادہ آیا اس کی شاندار صورت دیکھتے ہی حاضرین سمجھ گئے یہ جاسوس نہیں ہو سکتا۔ تواضع تکریم سے بٹھایا اور پوچھا کیسے آنا ہوا اور کہاں کے رہنے والے ہیں

شہزادے نے نہایت معقولیت سے جواب دیا، اپنا حسب نسب بتایا، باپ کی وفات اور بڑے بھائی کی چیرہ دستی کی کیفیت بیان کی۔ محفل میں چند آدمی ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے شہزادے کو اپنے باپ کے دربار میں دیکھا تھا، وہ فوراً پہچان گئے۔ دوسروں کو اس کے خاندان کی قدامت و عظمت اور ملک کی وسعت سے آگاہ کیا سب شہزادے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اس بات پر متفق ہوئے کہ شرافت ذاتی و نسبی کے لحاظ سے کوئی اس سے زیادہ ان کی سرداری کا مستحق نہیں۔ چنانچہ اسی وقت تمام ارکانِ سلطنت نے شہزادے کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس طرح شہزادہ اپنے توکل کے طفیل بادشاہ بن گیا۔ اس ملک میں دستور تھا کہ نئے بادشاہ کو پہلے دن سفید ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں گشت کرواتے تھے۔ شہزادے سے بھی یہی رسم ادا کروائی گئی۔ دروازے کے قریب جلوس پہنچا تو اس نے وہ کتبے دیکھے جو دوستوں نے وہاں لکھے تھے۔ حکم دیا کہ ان کے نیچے یہ بھی لکھ دیں کہ کسب و کمال اور عقل و جمال کا ثمرہ تبھی ملتا ہے۔ جب تقدیر موافق ہو اور عبرت کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ ایک شخص صبح کو قید خانے میں پابجولاں تھا اور شام کو سلطنت کے ایوان میں تختِ زرنگار پر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد شہزادہ محل میں آیا، مسند پر بیٹھا، اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اپنے تینوں دوستوں کو بُلایا۔ سوداگر بچے کو وزیر کا شریک مقرر کیا۔ دہقان زادے کو توشہ خانے کی داروغگی سپرد کی، اور خوبصورت جوان کو بھاری خلعت اور بہت سا انعام دے کر رخصت کیا۔ اس کے بعد ارکانِ دولت سے مخاطب ہو کر فرمایا، تم میں بہت سے عقل، شجاعت، ہنر، سلیقے میں مجھ سے برتر ہوں گے لیکن خدا جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے۔ میرے یہ تینوں ساتھی ہنر اور خوبیاں رکھتے تھے اور ہر ایک کو اپنے پر بھروسہ تھا، لیکن میرا خدا کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔ اور میں نے اپنے سب کام اسی کارسازِ حقیقی کے حوالے کر رکھے تھے۔ توکل میرا وظیرہ تھا اور رضا و تسلیم میرا شیوہ۔ اہل دربار میں سے ایک اٹھا اور کہنے لگا آپ نے جو فرمایا وہ عین حکمت ہے اور اسی سے آپ کا حکومت کا حق ہم سب پر ثابت ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایسے نیک سیرت اور صاحب بصیرت بادشاہ کا سایہ میسر آیا۔ دوسروں نے بھی اسی طرح اظہارِ عقیدت کیا۔ آخر میں ایک پیر پاک ضمیر کھڑا ہوا اور دعا و ثنا کے بعد یوں گویا ہوا کہ آپ نے جو قضا و قدر کے بارے میں زبانِ گوہر فشاں سے فرمایا اس کی تائید میری اپنی سرگزشت سے ہوتی ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔ بادشاہ نے کہا، ضرور سناؤ۔

پیر پاک ضمیر کی کہانی اس کی اپنی زبانی

پیر پاک ضمیر نے کہا، میں ایک امیر کا ملازم تھا لیکن کچھ عرصے بعد دنیا کی بیوفائی دیکھ کر سب چیزوں سے سیری ہو گئی۔ نوکری چھوڑ چھاڑ کر گوشۂ قناعت اختیار کیا اور توشۂ آخرت کی فکر میں لگ گیا۔ ایک دن بازار میں دیکھا کہ کوئی شکاری دو ہدہد بیچ رہا ہے اور وہ بیچارے زبانِ حال سے ایک دوسرے سے اپنا دکھڑا بیان کر رہے ہیں۔ مجھے ترس آیا، ارادہ ہوا دونوں کو خرید کر آزاد کر دوں شکاری سے دام پوچھے تو دو درم بتائے یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا کیونکہ دو درم میری کل کائنات تھی۔ دے دیے تو کیسے گزر کروں گا۔ آخر توکل کیا اور دو درم میں ہدہد خرید کے شہر کے باہر لے جا کر چھوڑ دیے۔ وہ ایک دیوار پہ جا بیٹھے اور میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ بولے اور تو ہم اس وقت کچھ خدمت نہیں کر سکتے، البتہ اس

دیوار کی جڑ میں ایک جواہرات کا صندوقچہ گڑا ہے وہ کھود کر نکال لے تیرا مال ہے۔ مجھے سن کر بہت تعجب ہوا۔ پوچھا یہ طرفہ ماجرا ہے کہ تمہیں زمین میں گڑا صندوقچہ نظر آ گیا اور مٹی میں دبا جال نہ دکھائی دیا۔ بولے جب قضا آتی ہے تو نہ بصارت کام دیتی ہے نہ بصیرت۔ یہ آپ بیتی سنا کر پیر پاک ضمیر نے کہا، اے بادشاہ میں نے اس دیوار کے نیچے کھود کر صندوقچہ نکال لیا اور وہ اب تک میرے پاس موجود ہے۔ آپ فرمائیں تو اسے خزانۂ عامرہ میں پہنچا دوں۔ بادشاہ نے کہا، وہ تیری اپنی نیکی کا پھل ہے اور تیرا ہی حصہ ہے۔ تو نے یہ کہانی کہہ کر جو حکمت کے موتی یہاں بکھیرے ہیں ہمارے لیے وہی کافی ہیں۔ حاضرین بادشاہ کے اس جواب سے از حد خوش ہوئے اور دل و جان سے اس کی فرمانبرداری پر کمربستہ ہو گئے۔

یہاں تمام ہوئی داستان جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توکل میں اور اپنے کام قضا و قدر کے سپرد کرنے میں کیسے فائدے ہیں۔

جب حکیم بیدپائے یوں ہوشنگ کی آخری وصیت کی تفصیل بیان کر چکا تو رائے دابشلیم جھک کر آداب بجا لایا اور بولا کہ آپ کی ہمت اور برکت سے میری تمنا بر آئی۔ اب ملتمس ہوں کہ میں جو ناچیز ہدیہ از رہ اخلاص خدمت میں پیش کرنے کو لایا ہوں وہ از رہ کرم قبول فرمائیں۔ برہمن نے کہا، میں دنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہو چکا ہوں اور دوبارہ دنیا کے مال و متاع سے اپنا دامن آلودہ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھ پر کچھ احسان کرنا چاہتے ہیں تو یہ درخواست ہے کہ آپ میری ان سب باتوں کو کتاب کی صورت میں جمع کر لیجئے اور اس کتاب کو ہدایت نامے کے طور پر استعمال کیجئے۔ اس ذریعے سے آپ مجھے ہمیشہ یاد کرتے رہیں اور میرے حق میں دعا فرماتے رہیں۔ کیونکہ بادشاہ عادل کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ دابشلیم نے بسر و چشم یہ بات منظور کی اور برہمن سے رخصت ہو کر اپنے دارالملک کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ جواہر حکمت جو ساتھ لایا تھا، رشتۂ تالیف میں پرو دیے اور جب تک زندہ رہا ان سے ہر اہم مسئلے اور مرحلے میں مدد لیتا رہا۔

جب خجستہ رائے سے شاہ ہمایوں فال نے یہ تقریر دل پذیر شروع سے آخر تک سنی تو نہایت خوش ہوا۔ وزیر سے کہنے لگا تو نے یہ داستان بیان کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ آج سے میں بھی انہی نصیحتوں کو اپنا دستور العمل بناؤں گا۔ ان باتوں نے میرے دل پر عجیب اثر ڈالا ہے، اور یہ سب تیری راستی اور خلوص کا کرشمہ ہے، کیونکہ کوئی بات بجائے خود کیسی ہی اچھی ہو، اگر کہنے والے کا دل صاف نہیں، تو سننے والے کے دل میں گھر نہیں کر سکتی۔ وزیر نے دعا دی اور کہا، آپ نے جو فرمایا عین صواب ہے۔ مکار و ریاکار کی بات خس و خاشاک میں آگ کی طرح ہے جو بھڑکتی ہے اور ذرا سی دیر میں بجھ جاتی ہے لیکن وہ سخن جو صدق و صفا پر مبنی ہے صبح کی سفیدی کی مانند ہے جو دم بدم لحظہ بلحظہ بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ زمین آسمان اس کے نور سے روشن ہو جاتے ہیں۔

ہمایوں فال نے بھی دابشلیم کی طرح ان حکایتوں کو قلمبند کیا اور ان نصیحتوں پر عمر بھر کاربند رہا۔ اسی کی بدولت صفحۂ روزگار پر اس کا ذکر جمیل اب تک یادگار باقی ہے۔

فاختہ لومڑی اور بگلے کی کہانی

(کلیلہ و دمنہ کی یہ آخری کہانی انوار سہیلی میں نہیں ہے چونکہ دلچسپ ہے عربی سے یہاں نقل کی جاتی ہے)

بادشاہ دابشلیم نے فیلسوف (بیدپائے) سے فرمائش کی کہ اب کسی ایسے شخص کی مثال سنائیے جو دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور اس کو اپنا ہوش نہیں۔ فیلسوف نے کہا، اس بارے میں فاختہ لومڑی اور بگلے کی حکایت پیش کی جا سکتی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کیا قصہ تھا۔

فیلسوف نے کہا، ایک فاختہ نے کھجور کے بہت اونچے درخت پر گھر بنایا بڑی مشقت سے تنکے چن چن کر چوٹی تک پہنچائے اور جب گھونسلا تیار ہو گیا تو انڈے دیے اور سینے بیٹھ گئی۔ کچھ دنوں بعد بچے نکلے ذرا بڑے ہوئے تو ایک لومڑی جو تاک میں تھی اور جس کو اندازے سے پتا لگ گیا تھا کہ اب بچے نکل آئے ہیں درخت کے نیچے آئی اور چلا کر فاختہ سے کہنے لگی کہ اپنے بچے نیچے پھینک دے، ورنہ میں ابھی درخت پر چڑھ کر تیری خبر لیتی ہوں۔

فاختہ بیوقوف نے ڈر کے مارے بچے گرا دیئے اور لومڑی ان کو کھا گئی۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ایک دفعہ جب بچے نکلے تو کہیں سے ایک بگلا درخت پر آن بیٹھا۔ فاختہ کو افسردہ دیکھ کر پوچھنے لگا تم ایسی غمگین کیوں ہو۔ فاختہ نے جواب دیا، میاں بگلے کیا کہوں۔ ایک لومڑی نے جان عذاب میں کر رکھی ہے۔ جب بچے نکالتی ہوں آتی ہے اور ڈراتی دھمکاتی ہے کہ بچے پھینک ورنہ میں درخت پر چڑھتی ہوں۔ بگلا بولا، اب کے بچے لینے آئے تو اس سے یوں کہیو میں تو بچے نہیں پھینکتی تجھ میں ہمت ہے تو چڑھ آ اور کھا لے۔ میرا کیا ہے، میں اڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔ لومڑی آئی تو فاختہ نے یہی جواب دیا۔ لومڑی نے پوچھا یہ تجھے کس نے سکھایا۔ فاختہ نے کہہ دیا بگلے نے یہ سن کر لومڑی بگلے کی تلاش میں چل دی۔ دیکھا دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ قریب پہنچ کر کہنے لگی۔ بھئی بگلے جب تیرے دائیں طرف سے ہوا چلتی ہے تو سر کدھر کر لیتا ہے۔ بگلے نے جواب دیا، بائیں کو۔ پوچھا جب بائیں سے چلتی ہے تو کدھر کو بولا دائیں کو یا پیچھے کو لومڑی نے کہا، جب چاروں طرف سے ایک ساتھ ہوا چلتی ہے تو کیا کرتا ہے۔ بگلے نے کہا تب پروں میں سر چھپا لیتا ہوں۔ لومڑی کہنے لگی، سر پروں میں کیسے چھپا لیتا ہے میری تو سمجھ میں نہیں آیا ذرا چھپا کر دکھا۔ بھئی تم پرندوں کو بھی خدا نے عجب فضیلت بخشی ہے، تم ایک گھڑی میں وہ بات معلوم کر لیتے ہو جو ہمیں برس بھر نہیں سوجھتی اب یہی کیسے مزے ہیں کہ جب ہوا یا سردی لگی پروں میں سر چھپا لیا۔ اچھا ذرا چھپا کر دکھا دو۔ بگلے نے اپنا سر پروں میں گھسا لیا۔ لومڑی نے جھٹ لپک کر گردن پکڑ لی اور بولی، اے اپنی جان کے بیری، فاختہ کو تو ترکیبیں بتاتا پھرتا ہے اور اپنی خبر نہیں رکھ سکتا۔ یہ کہا اور بگلے کو مار کر کھا گئی۔

دبستان لکھنؤ کی ایک جھلک

لکھنوی تہذیب کا پس منظر

جب نواب برہان الملک ۰۰ امین الدین خان نیشاپوری شہنشاہ دربار دہلی کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہو کے آئے تو شیخ زادگان لکھنؤ کو مغلوب کر کے قدیم مستقر اودھ یعنی شہر اجودھیا میں پہنچے اور آبادی سے فاصلے پر یعنی دریائے گھاگرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چونکہ انتظام صوبہ کی مصروفیات میں انہیں عالیشان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے ایسے نمائشی کروفر کا انہیں شوق تھا اس لئے ایک زمانے تک خیموں میں زندگی بسر کی۔ جب چند روز کے لئے انہیں برسات میں تکلیف ہوئی تو تھوڑی دور ہٹ کر ایک مناسب مقام پر اپنے لئے ایک چھپر بنوا لیا۔ اس بات کی وضاحت منشی فیض بخش نے اپنی کتاب "تاریخ فرح بخش" میں پوری تفصیل سے کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ولیم صاحب نے ۱۸۸۹ء میں کیا اور طبع گورنمنٹ پریس الہ آباد میں ہوئی۔ اس چھپر کے گرد کچی دیوار کا ایک وسیع و عریض حصار کھنچوایا جس کے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوا دیئے تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جا سکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر رسالے، پلٹن، توپ خانے، اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے۔ برہان الملک کو چونکہ عمارت کا شوق نہ تھا، اس لئے ان کے زنانے اور بیگمات کے قیام کے لئے بھی کچھ ہی مکانات بنوا لئے گئے۔ غرض اس کچے بنگلے میں اس وقت کا والی اودھ آرام و آسائش کے ساتھ رہتا تھا اور اسے کسی بات کی شکایت نہ تھی اور اس کا یہ دارالامارت چند روز میں "بنگلہ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد فیض آباد شہر کی جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب ان دنوں اس کی کچی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لئے باغ اور پُر فضا و فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں اور شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ اس کچے احاطے کا ایک پھاٹک دلی دروازہ کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا۔ اس کے باہر دیوان آتما رام کے بیٹوں نے ایک شاندار بازار بنوایا اور اسی کے سلسلے میں رہنے کے مکانات بھی تعمیر کرائے اسی طرح اسمٰعیل خان رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات تیار ہو گئے۔ نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لئے تباہی چھا گئی جس کی وجہ سے اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے رکھ دیا۔ اس لئے کہ ان کے فرزند نواب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لئے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے گو سال میں ایک دو راتیں اپنے باپ دادا کے قدیم مسکن میں ضرور بسر کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۴ء میں انہیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔

اس وقت وہ کمال بے سر و سامانی سے بھاگتے ہوئے فیض آباد میں آئے اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لے کر بریلی کی راہ لی۔ تاکہ روہیلکھنڈ کے افغانوں کے پاس جا کے پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے ان کی صلح ہو گئی۔ جس کی رو سے شجاع الدولہ کے ذمہ واجب تھا کہ محاصل ملک میں سے پنج آنی انگریزوں کو ادا کیا کریں۔ صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گزر شہر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا جہاں احمد خان بنگش سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے کے پرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے۔ انہوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب اگر آپ کو عنان حکومت ہاتھ میں لینا ہو تو میری ان دو باتوں کو نہ بھولئے۔ ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا۔ بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑ دو اور فیض آباد کو اپنا دارالحکومت بناؤ۔ یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل میں بیٹھ گئیں اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد ۱۷۶۵ء میں جو انہوں نے اپنی قلمرو کا دورہ کیا تو سیدھے فیض آباد آئے اور اسی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اب یہاں انہوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کرنے لگے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سر نو تعمیر کرایا۔ جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔ مغلوں کے جو مکانات اندر واقع تھے ڈھا دیئے اور اپنے اکثر خانگی ملازموں کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنائیں۔ اس حصار کے گرداگرد ہر طرف دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا۔ جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی وضع سے درست کی گئی اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ملی کہ اپنی حیثیت کے مناسب زمین لے کر اس میدان میں مکان بنوائیں جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا دارالحکومت بنایا ہے ایک دنیا کا رخ ادھر کو پھر گیا۔ ہزارہا لوگ آ کے آباد ہونا شروع ہو گئے۔ شاہجہان آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھئے فیض آباد جانے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ دہلی کے اکثر باکمالوں نے وطن کو خیرباد کہہ کر پورب کا رخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے جو آ کے بستے اور فیض آباد کی سواد میں پھیلتے چلے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے لوگ اہل قلم۔ اہل سیف۔ تاجر۔ صناع اور ہر طبقے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے کچھ سالوں کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلیں تعمیر ہو گئیں۔ اسی زمانے میں ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوئے جن کی سڑک قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کر سڑک الہ آباد کے نکڑ تک چلی گئی تھی اور اتنی چوڑی تھی کہ دس چھکڑے برابر آسانی سے گزر سکتے تھے۔ اس کی فصیل پر باقاعدہ فوجوں کے دستے رات بھر گشت کیا کرتے اور جا بجا پہرہ دیتے۔ فوج کی وردی لال تھی اور بے قاعدہ فوجیوں کی وردی سیاہ تھی۔ حوالی شہر میں دو مرغزار شکارگاہ قرار دیئے گئے تھے جن میں سے ایک مغرب کی جانب گدا بیگ خان کی مسجد سے گپتار گھاٹ تک چلا گیا تھا۔ اس میں شکار کے جانور کثرت سے چھوڑ دیئے گئے تھے پھر دوسری شکارگاہ شہر سے مشرق کی طرف موضع جنوراہا اور چھاؤنی نوساہی سے دریا کے کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل تھا۔

خاص شہر کے اندر تین ایسے باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے اگر ان میں سیر کریں۔ ایک انگوری باغ جو قلعے کے اندر واقع تھا اور اس کے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موتی باغ جو عین چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس باغ کی شہرت اتنی تھی کہ شہنشاہ دہلی عالم بادشاہ جب الہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد سے ہو کر گئے۔ ان تینوں باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ بھی نواح شہر میں لکھنؤ کے راستے پر تھے نواب شجاع الدولہ

کو شہر کی آرائش کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار ہو کر سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے۔ کل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضے میں تھی اور فیض آباد میں رہا کرتی تھی اس کی تعداد بہت تھی۔ اس کے افسر اعلیٰ سید احمد تھے جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے جلد کا بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

آدمیوں کی کثرت اور سپاہیوں کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک میں اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گزرنا دشوار ہو جاتا۔ فیض آباد نہ تھا انسانوں کا جنگل تھا۔ چوک اور کونوں پر ملکوں ملکوں کا مال ڈھیر تھا۔ ہر طرف سے تاجروں کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے۔ منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش جن کی عنایت سے ہمیں یہ واقعات معلوم ہوئے ہیں خود اس زمانہ میں موجود تھے اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش کا بیان

منشی فیض بخش لکھتے ہیں کہ میں جب پہلے پہل گھر چھوڑ کر فیض آباد میں گیا ہوں تو ممتاز نگر تک پہنچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیاں، گرما گرم کھانا کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے وغیرہ پک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں نان خطائیاں۔ مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری کے لئے ان دکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گزرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا ہوں اور خاص چوک میں ہوں۔ مگر حیران تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہنچ گیا۔ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا۔

"جناب شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں؟" اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور البیلیاں جدھر جاتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشہ کر رہے ہیں۔ اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشوں میں مشغول ہیں۔ یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے حیرت زدہ ہو کر رہ گیا صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب قوالوں اور طبلوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہر دن اور گھڑیوں کے گزر جانے پر بار بار نوبت بجتی جن کے شور سے کان اڑے جاتے۔ سڑکوں پر دیکھئے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں خچروں، شکاری کتوں، گائے بھینسوں، بیلوں چھکڑوں اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا جن کا شمار حساب و اندازے سے باہر تھا راستہ چلنا دشوار تھا۔

عجیب رونق اور تمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضع داران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے۔ حاذق اطبائے یونانی۔ اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے۔ ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویئے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے۔ ادنیٰ و اعلیٰ کی جیبیں روپوں اشرفیوں سے بھری ہوتی تھیں اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس کا خواب بھی نہیں دیکھا ہے۔ نواب شجاع الدولہ شہر کی رونق اور رعایا کی خوشحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی روز میں فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوےٰ کرے گا۔ چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام میں ہر موقع و محل پر روپیہ صرف کرنے کو تیار نہیں ہو جاتے تھے۔ اس لئے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلیٰ دستکاروں، صناعوں اور طالب علموں نے اپنے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے فیض آباد کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے۔ بنگالے۔ گجرات۔ مالوہ حیدر آباد۔ شاہجہاں آباد۔ لاہور۔ پشاور۔ کابل۔ کشمیر اور ملتان کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علما کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے اور اس چشمہ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا فیض حاصل کر کے اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نواب شجاع الدولہ اور دس بارہ برس جی جاتے تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہان آباد، آباد ہو جاتا اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی ــــــ

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا اور ان نو سال میں بھی وہ صرف برسات کے چار مہینے شہر میں رونق افروز ہوتے باقی زمانہ اپنی سلطنت کے دوروں اور سیر و شکار میں صرف ہوتا تھا۔

شجاع الدولہ بہادر

نواب شجاع الدولہ بہادر کا طبعی میلان مہ جبین عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا۔ اسی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوشحال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے ساتھ دو دو تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ ان کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کے روانہ ہوتے اور ان کے اردگرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرہ رہتا اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کر لی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اس سے بد اخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ شاہدان بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی اور فیض آباد دلہن بن گیا۔

۱۷۷۳ء کا فیض آباد

۱۷۷۳ء میں شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی معلوم ہوتا تھا کہ نوابی پرچم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوہ پہنچے جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے میں ان سے شہر چھین کر قبضہ کر لیا اور احمد خان بنگش کی قلمرو میں داخل ہو کے کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے انہوں نے حافظ رحمت خان فرماں روائے بریلی کو لکھا ــــ

> "گزشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے مہاجی سیندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دو آبہ ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے میں نے آپ کا وہ علاقہ اس کے قبضے سے چھڑا لیا ہے اور آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ لہٰذا اب آپ پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی فوراً ادا کر دیجئے۔"

حافظ رحمت خان نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کر کے کہا۔

> "شجاع الدولہ لڑائی کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ بیس لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور باقی

> "تیس لاکھ تم جمع کردو۔"

ناعاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا۔

> "شجاع الدولہ کے آدمی دیکھنے ہی کے ہیں سو بھلا ہم سے کیا مقابلہ کریں گے۔ باقی رہی انگریزی فوج جو ان کے ساتھ ہے تو ان کی توپوں پر جس وقت ہم تلواریں سونت کر جا پڑیں گے تو سب کے حواس جاتے رہیں گے لینے دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حافظ رحمت خاں نے یہ جواب سن کر کہا۔

> "تمہیں اختیار ہے۔ مگر میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا۔ اور اس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تمہیں کو بھگتنا پڑے گا!"

بہرحال شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا۔ فوج لے کر چڑھ گئے لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت کی زبان سے پہلے ہی سنوا دیا تھا۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا مگر یہ فتح شجاع الدولہ کو سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی تھی۔ ۱۱ شعبان کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کر کے لکھنؤ آئے۔ ماہ مبارک رمضان لکھنؤ میں بسر کیا ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کر کے ۱۸ کو فیض آباد میں داخل ہوئے اور فتح کو نو مہینے دس دن ہی ہوئے تھے اور گھر پر پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ ۲۳۔ ذیقعد ۱۷۷۴ء کو وفات پاگئے اور ان کے ساتھ ہی فیض آباد کی ترقی کا عہد بھی ختم ہوگیا۔

اس وقت حکومت اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی بہو بیگم صاحبہ کا تھا جو نہایت ہی دولت مند بھی جاتی تھیں۔ ان کی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوئے۔ مگر ان کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی اور ماں صاحبہ کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹوں کو الگ رکھیں۔ چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا۔ بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو ان کی زندگی تک تھوڑی سی بہت رونق حاصل رہی اگرچہ ان کی زندگی میں نواب آصف الدولہ کی نااہلیوں نے بہو بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا۔ مگر اس محترم خاتون کی زندگی تک یہ جھگڑے اور مشکلات بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے ان کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی اور لکھنؤ کا دوسرا دور شروع ہوا۔

لکھنؤ کی بنیاد کب پڑی؟

ٹھیک ہے معلوم نہیں کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کر جو کچھ بتایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے۔ کہتے ہیں مہاراجہ رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب تخت پر دوبارہ بیٹھے تو یہ سرزمین جاگیر کے طور پر اپنے بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ ان ہی کے قیام سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہو گئی جس کا نام اس وقت لچھمن پور قرار پایا۔ اور وہ ٹیکرا لچھمن ٹیلا مشہور ہوا۔ اسی ٹیلے میں ایک بہت ہی گہرا غار یا کنواں تھا جس کی کوئی تھاہ نہ ملتی تھی اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جا کے اس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ یدھشٹر کے پوتے راجہ جنم جے نے یہ علاقہ بزرگوں رشیوں کو جاگیر میں دے دیا تھا۔ جنہوں نے یہاں چپے چپے پر اپنے آشرم بنائے اور بھگوان کے دھیان میں محو ہو گئے۔ ایک مدت بعد ان کو کمزور دیکھ کر دو نئی قومیں ہمالیہ کی ترائی سے آکے اس ملک پر قابض ہو گئیں جو باہم ملتی جلتی تھیں اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک "بھر" اور دوسری "پاسی" تھی۔ انہیں لوگوں سے سپہ سالار مسعود غازی کا ۱۰۳۰ء میں مقابلہ ہوا اور غالباً انہیں پر بختیار خلجی نے ۱۲۰۲ء میں چڑھائی کی تھی۔ لہذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آکے آباد ہوئے وہ انہیں دو حملہ آوروں خصوصاً سپہ سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے۔ بھر اور پاسیوں کے علاوہ برہمن اور کائستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسا لیا اور امن و امان سے رہنے لگے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام لچھمن پور سے بدل کر لکھنؤ کب ہو گیا اس آخری مروجہ نام کا پتا شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی پہلے سے موجود تھی جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ ۱۵۴۰ء (۹۴۶ ہجری) میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل جونپور میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور۔ لکھنؤ۔ پیلی بھیت ہوتا ہوا بھاگا تھا۔ لکھنؤ میں اس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا اور گو کہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور مہمان نوازی کے خیال سے ان چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپے اور پچاس گھوڑے اس کی نذر کیے تھے۔ اتنے تھوڑے سے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان دنوں یہاں کافی آبادی موجود تھی اور ان دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق اور خوشحال تھا۔

لچھمن پور سے لکھنؤ

اسی زمانے کے آنے والوں میں شاہ مینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزار پُرانوار آج تک مرجع انام ہے اور غالباً اسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے جنہوں نے خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے قیام کی وجہ سے پرانا ٹیکرا لچھمن ٹیلے سے شاہ پیر محمد ٹیلا ہو گیا۔ اور مرور زمانہ سے وہ گہرا غار بھی بھر گیا۔ اس پر بعد کے زمانے میں اورنگ زیب شہنشاہ نے جو خود یہاں آیا تھا ایک عمدہ، مضبوط اور شاندار مسجد بنا کے کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے صدائے اللہ اکبر بلند کر رہی ہے۔

۱۵۹۰ء میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کر دیا تو صوبہ اودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ ان دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاش معاش دہلی پہنچے۔ وہاں امرائے دربار میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصب داران شاہی میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی اور چند روز بعد بڑے تزک و احتشام سے اپنی جاگیر میں آکے آباد ہوئے۔ یہاں لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد ٹیلے پر مقیم ہو کے انہوں نے اپنا پنج محلا بنوایا شیخن دروازہ تعمیر کروایا اور لکھنؤ ہی میں پیوند زمین ہو گئے۔ ان کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لچھمی ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کروایا جو قرب وجوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا اور گرد و نواح کے لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لئے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربار شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا۔ یا اس لئے کہ اس قلعے کے ایک مکان میں چھبیس محرابیں تھیں اور ہر محراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کر باون مچھلیاں بنا دی تھیں۔ اس قلعے کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ بھون کا لفظ یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے یا باون سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعے کو تعمیر کیا وہ "لکھنا" نام ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ پڑ گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا۔ خواہ اس میں سے کوئی بات ہو۔ بہر حال اس شہر نے نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز کے بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخ زادوں کے علاوہ یہاں پٹھانوں کا گروہ آ گیا۔ جو جنوب کی طرف آباد ہوئے اور رام نگر کے پٹھان مشہور ہوئے۔ انہوں نے اپنی زمینداری کی حد اس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ ہے۔ کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھیئے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوتی تھی۔ ان پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف آباد ہو گیا۔ ان لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب ریذیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہیں۔ یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں کے حاکم تھے لیکن شیخ زادوں کا اثر سب پر غالب تھا اور قرب وجوار پر ان کا دباؤ پڑتا تھا جس کا غالب سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی میں رسوخ رکھتے تھے ان میں سے کئی شخص پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے۔

شہنشاہ اکبر کے دور کا لکھنؤ

شہنشاہ اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا۔ اور اس کی آبادی بڑھتی پھیلتی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ ان ہی شیخ زادوں میں سے مقرر ہوئے۔ لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے۔ جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے۔ فقط تحصیل زرسال کے زمانے میں ایک دورہ کیا کرتے اور ان کے نائب یہاں رہا کرتے لہٰذا ان سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ ہاں یہاں کے دو ایک شیخ زادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو ان کے تقرر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہنچا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ چنانچہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو باجپئی چڑھاوے کے لئے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمائے تھے اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوئے۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت موجود تھے۔ باجپئی ٹولہ۔ کٹاری ٹولہ۔ سوندھی ٹولہ۔ بنجاری ٹولہ اور اہیری ٹولہ تھا۔ اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نورالدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے باپ کی زندگی اور اپنے ایام ولیعہدی میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو مچھی بھون سے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبہ دار جواہر خان تھے۔ وہ تو دہلی میں رہتے تھے۔ مگر ان کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اس سے ملے ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کئے اور ان کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کروایا۔

عہد اکبری میں جبکہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلے آباد ہو رہے تھے لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا تھا کہ ایک فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی اور دربار شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لئے سند مستاجری حاصل کر کے یہاں اپنا اصطبل قائم کیا اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھلا پھولا کہ چوک کے متصل چار عالیشان مکان تعمیر کر لئے۔ سال ختم ہونے پر جب اس نے پروانہ مستاجری کی تجدید چاہی تو اسے دوبارہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اس پر بھی اس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شاہی حکام شہر نے اس کے مکان ضبط کر کے نزول سرکار کر لئے اور اسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیۂ سرکاری کے طور پر وہ چاروں مکان انہیں دے دیئے گئے۔ اور انہوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ ان چاروں مکانوں میں سکونت اختیار کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل" کہلاتے ہیں۔ ملا صاحب کے قدم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع بن گیا۔ اور علم کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو سلسلہ نظامیہ کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اس میں صوفیانہ برکتیں بھی مضمر تصور کی جاتی ہیں اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دور کے طلبہ لکھنؤ میں جمع ہوتے تھے۔

یورپین سیاح ٹیکٹ جو ۱۶۳۱ء یعنی شاہجہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا۔ لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے"۔ عہد شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ انہیں دونوں کے نام سے انہوں نے محمود نگر کے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کئے۔ اسی زمانے میں یہاں اشرف علی خان نام ایک رسالدار تھے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بسایا۔ اور ان کے بھائی مشرف علی خان نے نالے کی دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا۔ جس کا نام مرور ایام سے اب نوبستہ ہو گیا ہے انہیں دنوں پیر خان نام ایک اور فوجی افسر تھے جنہوں نے ان سب محلوں سے مغرب کی طرف دور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک پیر خان کی گڑھی کہلاتا ہے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا۔ اس موقع پر اس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کروائی جو خاص لچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لئے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اس نے فرنگی محل کے مکانات علامہ زمان ملا نظام الدین کی نذر کئے ہوں گے۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبہ دار گردھا نانگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھا نانگا نے سرکشی اختیار کر لی اور ارادہ کیا کہ چچا کی جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کر اس نے اظہار اطاعت کیا اور دربار سے اسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔

شیخ زادوں کا اثر و رسوخ

مگر یہاں کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی ہو، شیخ زادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی لے کر آیا ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ ان کے حلقے میں قدم رکھے مچھی بھون کو اگرچہ قصر امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخ زادوں نے اسے اپنی موروثی جائیداد بنا لیا تھا اور دہلی سے جو والی آتا اس کے پاس پھٹکنے نہ پاتا۔ انہوں نے مچھی بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کر لی تھیں جن میں سے ایک کا نام مبارک محلا تھا اور دوسری کا نام پنچ محلا۔ پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پانچ منزلہ عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوئے تھے اور ان کے جنوب طرف ایک بڑا محرابدار پھاٹک تھا جو شیخن دروازہ کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخ زادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے اسی پھاٹک سے ہو کر گزرتے۔

اسی پھاٹک کی محراب میں بانکے شیخ زادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو جھک کر سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کسی کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے یہاں تک کہ وہاں سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے تو انہیں بھی مجبوراً اس تلوار کے آگے سر جھکانا پڑتا تھا۔

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۷۳۲ء میں نواب سعادت خان برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آئے۔ جن سے ہندوستان کے اس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی تھی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقشِ اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ضمیمہ تھا۔ اس ضمن میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اس بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔

نواب سعادت خاں برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے ۱۷۰۶ء عہد بہادر شاہ میں ہندوستان میں تشریف لائے۔ ان کے بیٹے میر محمد باقر ساتھ تھے۔ جنہوں نے یہاں شادی کر لی اور باپ بیٹوں نے ناظم بنگالہ کے زیر حمایت عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔ میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان میں آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سنا کہ والد نے سفر آخرت کیا۔ اور اب دونوں بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوئے۔ جہاں پہنچ کر میر محمد امین کو شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس میں انہوں نے ایسی لیاقت اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگوں میں شہرت ہو گئی۔ چند ہی روز بعد منصب داروں میں شامل ہوئے۔ پھر صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا اور اعلیٰ طبقہ امرا میں شمار کئے جانے لگے۔

ان دنوں دہلی میں سادات کا زور تھا۔ محمد امین نے ان کو ختم کر کے سیدوں کا زور ہمیشہ کے لئے توڑ دیا اور لڑائی میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور برہان الملک کا خطاب عطا ہوا اور اسی وقت اکبر آباد کے صوبہ دار مقرر ہو گئے۔ اس کے تھوڑے سے دنوں بعد وہ صوبہ اودھ کے صوبہ دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہشیار اور نہایت بیدار مغز تھے اور بڑے بہادر اور شجاع بھی تھے۔ شاہی توپ خانے کو اپنے ہاتھ میں لے کر انہوں نے ایسی زبردست قوت پیدا کر لی جیسی ان دنوں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ اسی زمانے میں کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا اور کئی افسر جو اس کی سرکوبی کو گئے اس کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوئے اور یلغار کرتے ہوئے پہنچے۔ بھگونت سنگھ نے چالاکی سے ان کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے سے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر برہان الملک نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنوں کے نرغے میں ان کی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں بھگونت سنگھ ان کے تیر کا نشانہ ہوا اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی۔ ان دنوں مرہٹوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ انہوں نے تاجدار دہلی سے چوتھ مقرر کرا رکھی تھی اور بڑے بڑے سورما ان کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹوں کو زبردست فوج کے ساتھ ایسی شکست دی کہ ان کے حواس جاتے رہے۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ برہان الملک نے تعاقب کیا۔ واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی نہ روک دیئے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی مگر اس بد نصیب زوال پذیر سلطنت کو منظور ہی نہ تھا۔ درباریوں کی سازش اور مقربین دربار کے حسد نے برہان الملک کی رفتار کو رکوا دیا۔

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلا دیا کہ بادشاہ میں اپنے نیک و بد کے سوچنے کی صلاحیت نہیں اور اہل دربار خود غرض اور بد دیانت ہیں۔ فوراً مرہٹوں سے صلح کر لی۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے میں جا کے قیام کریں۔ اور سب سے الگ ہو کے اپنے علاقے کو مضبوط بنا دیں۔ غرض برہان الملک نے دل میں سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ پنپنے والی نہیں ہے۔ اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے اور دربار دہلی کو اس کی قسمت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

بانکوں کی تلوار ٹوٹ گئی

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شیخ زادوں کا زور تھا انہوں نے اپنی عادت کے موافق انہیں بھی روکا۔ مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دو روائتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے یہاں تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے۔ چونکہ وہ سابق کے تمام صوبہ داروں کے مقابلے میں تجربہ کار، متین اور سنجیدہ تھے ٹھہر گئے۔ اور محمود نگر میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخ زادوں کی دعوت کی۔ ان سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ لیکن جس وقت غافل شیخ زادے الوانِ نعمت کا مزہ لوٹنے میں مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی۔ جو برابر بڑھتی ہی چلی یہاں تک کہ مچھی بھون کے پاس جا پہنچی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بنگش نے برہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخ زادے بڑے شورہ پشت ہیں ان سے پیش پانا آسان نہیں۔ مگر قرب و جوار کے دوسرے شیوخ ان کے خلاف ہیں۔ آپ ان لوگوں سے مدد لیجئے اور انہیں کی مدد سے لکھنؤ والوں کو زیر کیجئے۔ چنانچہ برہان الملک نے کاکوری میں قیام کر کے شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنا لیا۔ ان ہی کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے اور یہ سن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے میں مقابلے کا سامان کیا گیا ہے۔ اصلی راستے سے کترا کر

مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گوگھاٹ کے پاس دریا کے پار اترے اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آکے اچانک مچھی بھون میں آپڑے۔ بغرض جو صورت ہو۔ انہوں نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو قلعے پر قبضہ کر لیا۔

جب مچھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا۔ شیخ زادوں کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے بڑی عاجزی سے سر جھکا دیا۔ برہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے شیخن دروازے میں داخل ہوئے اور اس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادروں سے سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخ زادوں سے کہا۔

"ہمارے قیام کے لئے مچھی بھون خالی کر دو۔"

اس میں انہوں نے لیت و لعل کرنی چاہی مگر نہ چلی۔ آخر ایک ہفتے کی مہلت دی گئی اور اس مدت کے اندر شیخ جو کچھ اسباب لے جا سکے اٹھا لے گئے اور جو رہ گیا اس پر برہان الملک کے سپاہیوں نے قبضہ کر لیا۔ قلعے میں جا کے رہنے سے پہلے اس کے پاس ہی خیمے ڈال کے وہ رہ رہے تھے۔ وہاں ایک نوبت خانہ تعمیر کرا دیا جس میں دربار اودھ کے آخر عہد تک روزانہ چھ وقت نوبت بجتی تھی۔ اس کے بعد برہان الملک اجودھیا میں گئے اور دریا کنارے وہ بنگلہ بنوایا جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آتے اور قیام کرتے تھے۔ کیونکہ صوبے کا مستقر یہی شہر تھا۔ ان کے زمانے میں یہاں کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ مگر یہ سب محلے ان کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے جہاں مستقل سکونت کے لئے لوگوں نے مکان بنانا شروع کر دیئے۔ سید حسین خان کا کٹرہ۔ ابوتراب خان کا کٹرہ۔ محمد علی خان کا کٹرہ۔ خدایار خان کا کٹرہ۔ بزن بیگ خان کا کٹرہ۔ وفا بیگ خان کا کٹرہ۔ جمال خان کا کٹرہ۔ باغ مہا نرائن۔ سرائے معالی خان اور اسمٰعیل گنج سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کی لشکر گاہیں ہیں۔ نواب برہان الملک چھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔

نادر شاہ کی آمد

نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو نواب برہان الملک کو بڑی تاکید کے ساتھ دلی بلایا گیا۔ اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ واقعات گزرے ان کو لکھنؤ سے تعلق نہیں۔ لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو چھوڑ گئے۔ نادر دہلی لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا۔ مگر وہ ابھی دہلی ہی میں تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ ان کے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش کرائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبہ داری انہیں دی جائے۔ لیکن راجہ لچھمن نرائن نے جو برہان الملک کے معتمد عہدہ داروں میں تھا نادر کی خدمت میں اس مضمون کی عرض داشت پیش کر دی کہ نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنی بیٹی ان کو چھوڑ کے صفدر جنگ کو بیاہ دی جو ان کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی ان کی طرف سے وہاں موجود ہیں۔ برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے۔ جسے چاہے عطا کرے۔ اس لئے کہ کوئی وارث نہیں ہے یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بُردبار۔ خدا ترس۔ لائق اور وعدے کے سچے ہیں اور سپاہ ان سے خوش ہے۔ قطع نظر اس کے حضور کے لئے برہان الملک نے دو کروڑ روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اس کے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے جس وقت حکم ہو حاضر کئے جائیں۔ ان وجوہ سے امید ہے کہ حضور انہیں کی سفارش فرمائیں گے۔"

یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ نے صفدر جنگ کے لئے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبہ داری لے لیا اور اپنے ایک مصاحب کو دو سو سواروں کے ساتھ اودھ میں صفدر جنگ کے پاس بھیجا۔ یوں خلعت صوبہ داری پہن کر صفدر جنگ نے وہ دو کروڑ کا تمسک نادر کے پاس بھجوا دیا اور اپنے علاقے پہ حکومت کرنے لگا۔ صفدر جنگ کا پورا نام مرزا مقیم ابو المنصور خان صفدر جنگ تھا۔ گو ان میں برہان الملک کی سی بہادری سادگی، راست بازی اور جفاکشی نہ تھی۔ مگر نہایت فیاض، بلند حوصلہ، رحمدل، رعایا پرور اور منتظم تھے۔ شہر سے تین میل کی مسافت پر انہوں نے قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا اور مچھی بھون کے اندر پنج محلے کی جو قدیم عمارت تھی اسے بھی شیخ زادوں سے لے لیا اور اس کے عوض میں دو گاؤں زمین شیخ زادوں کو دے دی۔ جس سے اگرچہ شیخ زادوں پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ مچھی بھون کو صفدر جنگ نے از سر نو تعمیر کرایا۔

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے میں رہنے پائے تھے کہ دلی میں ان کی طلبی ہوئی اور راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ میں چھوڑ کر وہ دہلی چلے گئے۔ نول رائے علم دوست۔ وقت کے پابند۔ جفاکش۔ بہادر اور بڑا منتظم تھا۔ اور اس کے ساتھ اسے خدا نے اپنے آقا کی اولوالعزمی اور فیاضی بھی دی تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پل تعمیر کرے۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے کے لئے گہرے کنوئیں کھدوائے۔ لیکن پائے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اپنے آقا کی طلب پر احمد خان بنگش کے مقابلے کے لئے جانا پڑا۔ اس مہم پر وہ بڑی زبردست فوج لے کر گیا۔ مگر مارا گیا۔ اور پل کا کام ناتمام پڑا رہ گیا۔ احمد خان بنگش اس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اس کے مقابلے کے لئے برہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اس کے حریف مقابل نہ ہو سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور ساتھ افغانوں کی طاقت ترقی کرتی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے۔ خود شہنشاہ دہلی کو اس کے مقابلے پر لا کھڑا کر دیا۔ مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اس کے اشارے پر رحمت خان نے اودھ کے شہروں اور قصبوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ خیر آباد پر قبضہ کر لیا اور خود احمد خان بنگش کا بیٹا محمود خان فوج لے کر چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کرے۔

۱۷۵۰ء میں پٹھانوں نے ملیح آباد میں اپنا تھانہ قائم کیا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیوں سے شہر خالی تھا۔ جو چند تھے وہ پٹھانوں کے آنے کی خبر سن کر بھاگ گئے تھے اور پٹھانوں کے کوتوال نے شہر میں آکر بے اعتدالیاں شروع کر دیں۔ ان دنوں شیخ زادگان لکھنؤ میں سب سے زیادہ سربرآوردہ شیخ معز الدین تھے۔ وہ افغانوں کے سردار سے شہر سے باہر جا کر ملے۔ اسی وقت کسی نے اس سے جا کر شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر و توہین کرتے ہیں۔ اور کوئی اس کا حکم نہیں مانتا۔ شیخ معز الدین بولے۔

"کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے۔ میں جاتا ہوں اور فساد کرنے والوں کو سخت سزا دوں گا۔"

یہ کہہ کر واپس آئے اور تمام بھائی بندوں کو بلا کر کہا۔

"پٹھانوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دیں۔ اور مقابلہ کر کے پٹھانوں کو یہاں سے نکال باہر کریں۔"

اس کے بعد شیخ معز الدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخ زادوں کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان میں بٹھا دیا اور منادی کرا دی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مغل کو کوتوال بنا کے بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ ہی علاقے کے نام

کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کر دیا۔ اور لوگ اس کے نیچے آ آ کے جمع ہونے لگے۔ یہ حالات سن کر پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شیخ زادوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور اپنی پرانی بہادری دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بھاگے اور موقع پا کے شیخ زادوں نے پٹھانوں کو سارے ملک اودھ سے نکال باہر کیا۔ دو سال بعد جب احمد خان بنگش سے صلح ہو گئی تو ۱۷۵۳ء میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور مہدی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک خاص مکان اپنے لئے بنوایا اور فوج کی درستی میں مصروف ہوئے۔ لیکن اس کی مہلت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاؤ تھا اور انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں لے جا کے دفن کی گئیں۔ جن پر نہایت ہی عالیشان مقبرہ موجود ہے۔

صفدر جنگ منصور علی خان کے انتقال کے بعد ۱۷۵۴ء میں ان کے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے جن کے حالات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ وہ ایک بیقرار طبیعت کے فرماں روا تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کا عہد بڑے بڑے فتنوں، یورشوں اور انقلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ ان ہی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی۔ جس میں احمد شاہ درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ روہیلکھنڈ کے پٹھانوں کی تمام زبردست فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹڈی دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے ۱۷۶۱ء میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان کارزار گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکر کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۷۶۴ء میں چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب انگریزوں کا ہے اور وہ ہی اس پر حکومت کریں گے۔

ان لڑائیوں سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ میں رہے۔ مگر بڑی بڑی مہموں اور سیاسی مصروفیات اور فوجی اصلاحات سے انہیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی اور آرائش کی طرف توجہ دیں۔ انہوں نے قلعے بنوائے۔ گڑھیاں قائم کیں۔ فوجی سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا۔ اس کی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کی تزئین و آرائش کرتے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد وہ فیض آباد میں جا کے سکونت پذیر ہوئے۔ ۱۷۷۵ء میں انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا اور نواب آصف الدولہ ان کے جانشین ہوئے۔

قارئینِ کرام!

ملک بھر کے عوام میں لازوال روشنی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ہم نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے آپ کے ہمدردانہ مشوروں اور مخلصانہ تعاون کی ضرورت ہے۔

دستِ تعاون بڑھائیے!

زندگی کے کسی مرحلے میں آپ نے ضرور کوئی ایسی کتاب پڑھی ہو گی جس کی سہانی یاد ابھی تک آپ کے ذہن میں تازہ ہے جس کے شگفتہ فقرات بادِ بہاری کے پُرکیف جھونکوں کی مانند آپ کے درِ دل پر دستک دے رہے ہیں۔

ہمیں بھی بتائیے!

وہ کونسی کتاب ہے جسے آپ آج تک اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں؟

دیکھیے! بھولیے گا نہیں!!

اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے چند لمحے 'روشنی کتابوں' کی عظیم جدوجہد کی نذر کیجیے۔ اپنی اولین فرصت میں ہمیں اُس کتاب کا نام لکھ بھیجیے۔ ہم آپ کی پسند کو شکریے کے ساتھ ہزاروں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں گے!

ہمارا پتا
نوٹ
کر لیجیے!

روشنی کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور